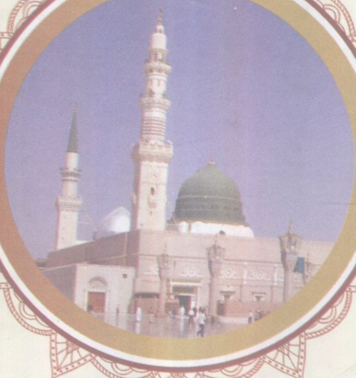
سیرت رسول ﷺ اور ہم



مولانا سید
احمد عروج قادری



مرتب
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہم

مولانا سید احمد عروج قادریؒ

مرتب
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مکتبہ قاسم العلوم

نام کتاب ——— سیرت رسول ﷺ اور ہم
مصنف ——— مولانا سید احمد عروج قادری
مرتب ——— ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
اہتمام ——— ملک اسد علی قاسمی
مطبع ——— نوید حفیظ پریس
ناشر ——— مکتبہ قاسم العلوم

ڈسٹری بیوٹر

ملک اینڈ کمپنی

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، پاکستان
Ph: 042-37248209 Mob: 0321-4021415

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت وسیرت اور دعوت وپیغام پر دنیا کی بیش تر زبانوں میں بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ اردو زبان بھی اس اعتبار سے مالا مال ہے کہ اس میں سیرتِ نبویؐ کے ہر پہلو پر قابلِ قدر لٹریچر موجود ہے اور اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم سیرتِ نبویؐ پر مشہور عالم دین مولانا سید احمد عروج قادری (۱۹۱۳-۱۹۸۶ء) کی تحریروں کا ایک مجموعہ ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔ یہ مجموعہ قیمتی مقالات پر مشتمل ہے۔ ان میں سیرت کے جن گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ موجودہ دور کے حوالے سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

پہلا مقالہ 'رسالت' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انکارِ رسالت کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے ان کا جائزہ لیا گیا ہے اور ضرورت رسالت کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اگلے دو مقالات میں رسالت محمدیؐ کا ثبوت اور مقصد بیان کیا گیا ہے۔ ایک مقالہ معراج کی حقیقت پر ہے۔ اس میں تسخیر کائنات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ اگلے چار مقالات میں مکی اور مدنی ادوار کا دعوتی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے کیا خدمات انجام دی گئیں؟ کن کن طبقات کی جانب سے مخالفتیں ہوئیں؟ ان کے جواب میں کیا رویہ اختیار کیا گیا؟ اسلامی دعوت کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئیں؟ یہ مباحث اس اعتبار سے بڑے اہم ہیں کہ ان کی روشنی میں موجودہ دور میں دعوت وتبلیغ کے لیے لائحۂ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے؟ ایک مقالے میں یہ موضوع زیر بحث آیا ہے کہ انبیاء کی پیروی کیوں ضروری رہی ہے اور اب آخری نبی پر ایمان لانا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا

کیوں ضروری ہے؟ آخری مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ سیرتِ نبویؐ کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کیسے کیا جائے؟

زیرِ نظر مجموعہ میں شامل یہ مقالات سیرتِ نبویؐ سے متعلق نئی جہتیں روشن کرتے ہیں۔ امید ہے، دینی، دعوتی اور تحریکی حلقوں میں ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو مرحوم کے حق میں صدقۂ جاریہ بنائے اور مرتب کو اجر سے نوازے۔ آمین۔

۲۶/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — محمد رضی الاسلام ندوی

۲۸/جنوری ۲۰۱۴ء

رسالت

رسالت کی ضرورت

دین اسلام جن بنیادوں پر قائم ہے ان میں توحید کو اصل الاصول کی حیثیت حاصل ہے اسی وجہ سے تمام انبیاء کرام کی دعوت کا نقطۂ آغاز توحید ہی رہی ہے، رسالت اور آخرت توحید ہی کے لوازم اور اس کی شاخیں ہیں۔

عقیدۂ رسالت کے سلسلے میں پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ:

آیا انسان کو وحی و رسالت کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

دیکھنے میں تو یہ سوال سادہ نظر آتا ہے لیکن فی الواقع سادہ نہیں ہے۔ اس سوال سے پہلے کچھ اور باتیں سمجھ لینے کی ہیں، ان کے بغیر اس سوال پر غور و فکر مفید نہیں ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ خود "ضرورت" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اس لفظ کو سمجھنے کے لیے ایک دوسرا لفظ "احتیاج" بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ ضرورت کے حقیقی مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ انسان کو بھوک پیاس لگتی ہے اور اس حالت میں وہ ضعف بھی محسوس کرتا ہے اب اگر کوئی کہے کہ انسان کو کھانے پینے کی ضرورت ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر انسان کو کھانا پینا بالکل نہ ملے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا، زندگی برقرار رکھنے کے لیے کھانا پینا ضروری ہے اور انسان اس کا محتاج ہے۔ بھوک، پیاس اور قوت میں انحطاط اس ضرورت کی علت اور بقائے حیات یا بقائے نفس اس کی غایت ہے۔ اسی طرح انسان بقائے حیات اور بقائے نوع کے لیے بہت سی چیزوں کا محتاج اور اسے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔

یہاں تک تو بات اتنی واضح ہے کہ معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ لیکن اس کے آگے جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

کیا انسان کی تمام ضروریات اسی بقائے نفس و بقائے نوع کی ضروریات پر ختم ہو جاتی ہیں؟ کیا اس کی فطرت میں ان داعیات کے سوا دوسرے داعیات نہیں پائے جاتے؟ کیا جانوروں

کا مقصد زندگی اور انسانوں کا مقصد زندگی ایک ہے؟ اس دنیا میں انسان کی اصل حیثیت کیا ہے؟ آیا یہ آزاد و خودمختار ہے کہ جو جی میں آئے کرتا پھرے یا اس کی زندگی کے لیے کوئی آئین و دستور بھی ہے؟ اور اگر ہے تو اس کا ماخذ کیا ہے؟ سوالات کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اسی طرح کے اور دوسرے سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان مسائل میں انسان اصلاً دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، انسانوں کا ایک مختصر گروہ تو یہ خیال رکھتا ہے کہ اس کائنات کا سرے سے کوئی خدا ہی نہیں ہے اور انسان اپنا آپ خدا ہے، اس کی زندگی کا مقصد ایک ترقی یافتہ حیوان کے مقصد زندگی سے مختلف نہیں ہے۔ اس وقت یہ گروہ میرے پیش نظر نہیں کیونکہ اس گروہ کے سامنے وحی و رسالت کا سوال رکھنا بے کار ہے۔ اس سے گفتگو کی بنیاد کچھ اور ہوگی ـــــ دوسرا بڑا گروہ۔ انسانوں کی عظیم اکثریت۔ اس کائنات کو بے خدا نہیں مانتی، ایک خالق کائنات کا اقرار کرتی ہے۔ وہ انسان کو محض ترقی یافتہ حیوان بھی نہیں مانتی بلکہ تسلیم کرتی ہے کہ انسان جسم کے علاوہ روح بھی رکھتا ہے اور اس کے روحانی داعیات و ضروریات، جسمانی داعیات و ضروریات سے مختلف ہیں۔ اس وقت یہی گروہ میرے پیش نظر ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کوئی مذہبی گروہ ایسا بھی ہے جو مخلصانہ طور پر مذکورہ بالا باتیں ماننے کے باوجود وحی و رسالت کا بالکلیہ انکار کرتا ہو۔ کوئی شخص اگر خدا کو اس کائنات کا خالق، مالک، حاکم اور ہادی تسلیم کرتا ہے، اس بات کا بھی یقین رکھتا ہے کہ اس نے اس کائنات کو محض کھیل کے طور پر بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے، انسان اپنے عقائد و اعمال کے لیے اس کے سامنے جواب دہ ہے اور وہ جزا و سزا کا بھی مستحق ہے، نیز یہ کہ انسان جسمانی و مادی داعیات و ضروریات کے علاوہ روحانی داعیات و ضروریات بھی رکھتا ہے تو پھر عقلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص وحی و رسالت کی ضرورت کا انکار کرے۔ کیا بھوک پیاس کے اقرار کے بعد کھانے پینے کی ضرورت کا انکار دائرۂ عقل کی بات ہو سکتی ہے؟

جن لوگوں نے بھی رسالت و وحی کا انکار کیا ہے اس کی علت یا تو یہ رہی ہے کہ وہ خدا کی ذات و صفات میں بھٹک گئے ہیں یا ان پر ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی مسلط ہو گئی ہے۔

جب رسالت اور آخرت توحید کے لوازم میں سے ہیں تو پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ توحید تو ثابت ہو جائے اور رسالت و آخرت ثابت نہ ہوں کیونکہ اذا ثبت الشیٔ ثبت بلوازمہ "جب کوئی شے ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔" کا قاعدہ تمام عقلاء تسلیم کرتے ہیں۔

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں توحید، آخرت اور رسالت پر جو دلائل دیے گئے ہیں ان کی ایک قسم لوازم سے استدلال بھی ہے۔ اللہ نے قرآن کے اولین مخاطبوں سے بار بار کہا ہے کہ جب تم ہماری یہ یہ صفتیں تسلیم کرتے ہو تو ان سے جو دوسری صفات لازم آتی ہیں ان کا انکار کیوں کرتے ہو؟

انکارِ رسالت کے وجوہ واسباب

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پہلے زمانے میں منکرین رسالت نے آخر کس بنیاد پر اس کا انکار کیا ہے۔ قرآن نے اپنے مخاطبین کے انکار رسالت کی جو علتیں اور جو وجوہ واسباب نقل کیے ہیں ان کو درج ذیل نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے۔

پہلا سبب

منکرین رسالت کے انکار کا ایک بڑا سبب ان کا یہ توہم رہا ہے کہ انبیاء کو ماوراء بشریت ہونا چاہیے۔ توہم پرست جاہلوں کے نزدیک نبوت اور بشریت کا اجتماع ہمیشہ سے ایک ناقابل یقین چیز رہی ہے۔ انہیں اپنے ہی جیسے انسان کا دعویٰ نبوت بہت عجیب بات معلوم ہوتی تھی اور وہ بار بار تعجب سے کہتے تھے کہ ہمارے ہی جیسا انسان خدا کا فرستادہ اور اس کا رسول کیسے ہوسکتا ہے۔ اس مضمون کی آیتوں سے قرآن بھرا ہوا ہے بلکہ ایک جگہ تو ان کی اس توہم پرستی کو اللہ تعالیٰ نے انکار رسالت کی سب سے بڑی وجہ قرار دیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَامَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ٥ (بنی اسرائیل:۹۴)

"لوگوں کے سامنے جب ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اس قول نے کہ کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔"

وہ بڑے تعجب سے پوچھا کرتے تھے:

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ (الفرقان:۷)

"یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔"

کھانا پینا، بازاروں میں عام انسانوں کی طرح چل پھر کر خرید وفروخت کرنا، شادی کرنا، صاحب اولاد ہونا، عام انسانوں کی طرح خوشی وغمی، رنج والم، بیماری وصحت اور دوسری بشری

تکلیفات سے دوچار ہونا نبی ورسول کے شایان شان نہیں ہے، اس کو ان تمام چیزوں سے بلند ہونا چاہیے، اسے ہمیشہ فرشتوں کے جھرمٹ میں رہنا چاہیے اور کائنات پر اسے اس طرح کا اقتدار حاصل ہونا چاہیے کہ وہ جو چاہے، ہو جائے۔ یہ تھا ان کا تصور رسالت، ان کا یہ تصور رسالت ان مطالبات سے واضح ہوتا ہے جس کی ایک لمبی فہرست قرآن نے پیش کی ہے۔ مثال کے طور پر صرف سورۂ بنی اسرائیل میں حسب ذیل مطالبات کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر چشمہ جاری کرو۔ (۲) اپنے لیے کھجوروں اور انگوروں کا باغ پیدا کرو اور اس میں نہریں رواں کرو۔ (۳) آسمان کو ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرادو۔ (۴) خدا اور فرشتوں کو روبرو ہمارے سامنے لے آؤ۔ (۵) اپنے لیے سونے کا ایک گھر بنالو۔ (٦) آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہمارے لیے ایک تحریر لے آؤ جس کو ہم پڑھیں۔

دوسرا سبب

ان کا یہ خیال تھا کہ نبی کو متمول اور صاحب جاہ ومنصب ہونا چاہیے۔ یہ بات شاید وہ بر سبیل تنزل کہتے تھے یعنی اصل بات تو یہ ہے کہ نبی ورسول کوئی بشر نہیں ہوسکتا بالفرض اگر خدا کو وحی بھیجنی ہی تھی اور کسی کو رسالت دینی ہی تھی تو اس کے مستحق مال ودولت اور جاہ ومنصب والے سرداران قوم تھے نہ کہ ایک ایسا شخص جس کے پاس نہ ریاست ہے، نہ سرداری ہے، نہ جاہ ومنصب ہے اور نہ مال ودولت کے لحاظ سے اسے کوئی امتیاز حاصل ہے، ایک ایسے شخص کو اللہ منصب رسالت نہیں دے سکتا لہٰذا یہ مدعی نبوت (نعوذ باللہ) جھوٹ بولتا ہے جب یہ کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، مجھ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو۔ اس طرح کے مضامین سے بھی قرآن بھرا ہوا ہے۔ قرآن نے مختلف اسالیب میں ان کے اس شبہے کا ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ۝
(الزخرف:۳۱)

”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ ہوا۔“

یعنی یہ کیسے ممکن ہے کہ نبوت ورسالت کے مستحق لوگوں کو چھوڑ کر اللہ یہ منصب کسی غیر مستحق کے حوالے کر دے لہٰذا مدعی رسالت کا دعویٰ رسالت ہی غلط ہے۔ یہ خیال صرف سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے مقابلے میں ظاہر نہیں کیا گیا بلکہ ہمیشہ منکرین رسالت نے اپنے وقت

کے نبی کے مقابلے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ فرعون نے اپنی قوم کے سامنے اپنے کو برسر حق اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برسر باطل ثابت کرنے کے لیے جو دلیل دی تھی وہ یہی تھی کہ میں ملک مصر کا بادشاہوں اور میرے مقابلے میں نبوت و رسالت کا دعویٰ کرنے والے کی اس ملک میں کوئی عزت نہیں ہے اگر اپنے دعوے میں یہ سچا ہے تو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اترتے اور فرشتے اس کے سامنے پرا باندھ کر کیوں کھڑے نہیں ہوتے۔ میں کسی کی عزت کرتا ہوں تو اسے سونے کے کنگن بخشتا ہون اور میری فوجیں اس کے سامنے پرا باندھ کر کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ خدا کا کیا نائب ہے کہ خدا نے اس کو سونے کے کنگن بھی نہیں بخشے اور فرشتوں کی فوج بھی اس کے سامنے پرا باندھ کر کھڑی ہونے کے لیے نہیں بھیجی۔

تیسرا سبب

نبی ان کے سامنے توحید و آخرت کی جو دعوت پیش کرتا تھا وہ اس دعوت کو بھی انکارِ رسالت کا بہانہ بنا لیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ شخص بہکی بہکی باتیں کرتا ہے اور جو شخص ایسی باتیں کرے وہ خدا کا رسول کیسے ہوسکتا ہے۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ (ص:۵)

”کیا اس نے بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا بلاشبہ یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔“

اتنی لمبی چوڑی کائنات کا انتظام بھلا ایک خدا کیسے چلا سکتا ہے جب تک بہت سے دیوتاؤں اور خداؤں کو انتظام و اختیار سپرد نہ کر دیا جائے، دنیا کے معاملات درست نہیں ہوسکتے۔

مشرکین مکہ خدا کی ذات و صفات سے جاہل تھے اور اپنے اس جہل و نادانی پر اس قدر نازاں کہ داعی توحید ہی کو دیوانہ سمجھتے تھے یا عوام کو باور کراتے تھے کہ اس شخص کی دعوت توحید کے پیچھے یقیناً کوئی ذاتی مفاد موجود ہے۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۚۖ (ص:۶)

”ان میں کے سردار چل کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو بے شک اس بات میں کوئی غرض ہے۔“

”ان میں کے سردار چل کھڑے ہوئے کہ چلو“ یہ الفاظ ہماری چشم تصور کے سامنے

ایک دل چسپ منظر پیش کرتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی جگہ قریش کے لیڈر بھی موجود ہیں، ان کے کچھ پیرو بھی ساتھ ہیں اور وہ لوگ کسی اہم معاملے کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ وقت کے نبی نے ان کے سامنے یہ دعوت پیش کی ہے کہ اس کائنات کا خدا ایک ہے، وہ یگانہ و یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اس لیے اس کی یکتائی پر ایمان لاؤ، میرا تم سے صرف یہی مطالبہ ہے۔ یہ مطالبہ سنتے ہی سرداران قوم بھڑک اٹھتے ہیں اور اپنے پیروؤں کی طرف رخ کر کے یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو یقیناً اس مطالبے کے پیچھے کوئی ذاتی غرض چھپی ہوئی ہے۔ پھر جب ہم ترمذی کی درج ذیل حدیث پڑھتے ہیں تو چشم تصور کا یہ قیاسی منظر واقعہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرِضَ اَبُوْطَالِبٍ فَجَاءَ تْهُ قُرَيْشٌ وَجَاءَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَ اَبِيْ طَالِبٍ مَجْلِسُ رَجُلٍ فَقَامَ اَبُوْ جَهْلٍ كَيْ يَمْنَعَهُ قَالَ وَشَكَوْهُ اِلٰى اَبِيْ طَالِبٍ فَقَالَ يَاابْنَ اَخِيْ مَاتُرِيْدُمِنْ قَوْمِكَ قَالَ اُرِيْدُ مِنْهُمْ كَلِمَةً تَدِيْنُ لَهُمْ بِهَاالْعَرَبُ وَتُؤَدِّيْ اِلَيْهِمُ الْعَجَمُ الْجِزْيَةَ قَالَ كَلِمَةً وَّاحِدَةً قَالَ كَلِمَةً وَّاحِدَةً فَقَالَ يَاعَمِّ قُوْلُوْا لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَالُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا مَاسَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَااِلَّا اخْتِلَاقٌ قَالَ فَنَزَلَ فِيْهِمُ الْقُرْاٰنُ صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ اِلٰى قَوْلِهٖ اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ (ترمذی)

''ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ابوطالب بیمار پڑے تو قریش کے لوگ ان کے پاس آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی آئے۔ ابوطالب کے قریب ایک شخص کے بیٹھنے کی جگہ خالی تھی، ابوجہل کھڑا ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں پر بیٹھنے سے روک دے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ پھر قریش کے لوگ نے ابوطالب سے آپ کی شکایت کی۔ ابوطالب نے حضورؐ سے کہا ''اے میرے بھتیجے! تم اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟'' آپؐ نے فرمایا: میں صرف ایک کلمہ چاہتا ہوں جو پورے عرب کو ان کا تابع فرمان بنا دے گا اور عجم ان کے پاس جزیہ بھیجنے لگیں گے۔ ابوطالب نے کہا صرف ایک کلمہ؟ آپ نے فرمایا، ہاں صرف ایک کلمہ۔ پھر آپ نے فرمایا اے چچا آپ سب مل کر کہیے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یہ

سنتے ہی سرداران قریش کہنے لگے صرف ایک الٰہ؟ ہم نے تو اپنی ملت میں یہ بات کبھی نہیں سنی، یہ تو یقیناً دل سے گھڑی ہوئی بات ہے۔ اس واقعہ کے بعد صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ سے لے کر اِنْ ھٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ تک کی آیتیں نازل ہوئیں۔"

اس حدیث سے متعلقہ آیات قرآنی کی توضیح بھی ہوتی ہے اور اسلام کی دعوت پیش کرنے کا ایک طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ حدیث اور طریقۂ دعوت مزید تشریح کا محتاج ہے۔ میں اس کی تشریح انشاء اللہ کسی اور موقع پر کروں گا یہاں جو بات زیر بحث ہے وہ اتنی ہی ہے کہ توحید کی دعوت انہیں بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی یہاں تک کہ وہ اس دعوت توحید کو انکار رسالت کا بہانہ بنا لیتے تھے۔

اسی طرح جب رسول انہیں یہ خبر دیتا تھا کہ اس زندگی کے بعد ایک اور دائمی زندگی آنے والی ہے جس میں اس دنیوی زندگی کا حساب لیا جائے گا تو وہ زندگی بعد موت کی خبر کو تعجب وانکار کے کانوں سے سنتے تھے اور خبر دینے والے کی ہنسی اڑاتے اور اس پر فقرے چست کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھَلْ نَدُلُّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُکُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ لا اِنَّکُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۚ اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ ط (سبا: ۷۔۸)

"منکرین کہتے ہیں، ہم تمہیں ایک شخص کا پتہ بتائیں جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب تم پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ گے تو از سر نو پھر پیدا کیے جاؤ گے، کیا وہ خدا پر جھوٹ باندھتا ہے یا اسے جنون ہے۔"

گویا یہ خبر اتنی غیر معقول ہے کہ دو باتوں میں کوئی ایک ہی بات ہو سکتی ہے، یا تو یہ خدا پر افترا کرتا ہے یا دیوانہ ہے، اس طرح وہ زندگی بعد موت کی خبر کو انکار رسالت کے لیے عذر بنا لیتے تھے۔

چوتھا سبب

کبھی وہ مجرد دعوے کو انکار کے لیے علت بنا لیتے تھے، جس طرح وہ توحید و آخرت کا بغیر کسی دلیل کے انکار کرتے تھے۔ اسی طرح وحی و رسالت کا بھی مجرد ایک دعوے کی شکل میں انکار کرتے تھے۔

کُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْھَا فَوْجٌ سَاَلَھُمْ خَزَنَتُھَآ اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ ۵ فَکَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ

شَیْءٍ ۚ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ○ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ○ فَاعْتَرَفُوا بِذَنْبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ○ (الملک:۸-۱۱)

"جب جہنم میں کوئی گروہ جھونکا جائے گا تو فرشتے سوال کریں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا، وہ جواب دیں گے کیوں نہیں، ہمارے پاس ڈرانے والا پہنچا تھا پھر ہم نے ان کو جھٹلایا اور کہا کہ اللہ نے کوئی شے نازل نہیں کی ہے، تم خود بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو، وہ کہیں گے کاش ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے، وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے تو اب جہنمی اللہ کی رحمت سے دور ہو جائیں۔"

ان آیتوں سے کئی باتیں بہ وضاحت معلوم ہوتی ہیں:

(۱) ابدی سزا پانے والے تمام گروہ اس دعوے میں شریک ہیں کہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی وحی نہیں اتاری۔ اس مجرد دعوے کی بنیاد پر انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کی شان میں گستاخیاں کیں۔

(۲) وہ خود یہ اعتراف کریں گے کہ ان کا دعوئ عقل سے دور تھا، اگر وہ اللہ کی دی ہوئی عقل کو کام میں لاتے اور نصیحت کرنے والوں کی نصیحت کو گوش ہوش سے سنتے تو وحی ورسالت کا انکار کر کے جہنم رسید نہ ہوتے۔ اس اعتراف میں یہ بات بھی چھپی ہوئی ہے کہ وحی و رسالت کا اقرار عین تقاضائے عقل کے مطابق ہے۔

(۳) وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے خود یہ بات ظاہر کر دیں کہ ان کو جو سزا دی گئی ہے وہ عدل و انصاف کی ترازو میں پوری اترتی ہے، ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا، لیکن اس وقت کا اعتراف انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گا کیونکہ دنیا میں انبیاء نے کھول کر یہ حقیقت جتادی تھی کہ اللہ تعالیٰ وحی و رسالت کے انکار اور رسولوں کی تکذیب کے جرم کو معاف نہیں کرے گا۔

(۴) جس طرح دنیا میں منکرین رسالت، رسولوں اور ان کے پیروؤں کو اپنے طنزیہ سوالات واعتراضات اور دوسری تدبیروں سے رسوا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اسی طرح قیامت میں ہر طرف سے ان پر طنزیہ سوالات کی ایسی بوچھار ہوگی کہ وہ فی الواقع رسوا

ہو کر رہیں گے۔ جہنم میں جھونکتے وقت فرشتوں کا یہ سوال ان کو نادم اور رسوا کرنے کے لیے ہی ہوگا۔

سورۂ یٰس میں کہا گیا ہے:

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا لا وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ لا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ○ (یٰسٓ:۱۵)

"انہوں نے کہا تم لوگ تو ہماری ہی طرح انسان ہو اور رحمٰن نے کچھ نہیں اتارا ہے، تم سب کے سب جھوٹ بول رہے ہو۔"

اس آیت میں ان کے انکار کی دو وجہیں ذکر کی گئی ہیں۔ رسولوں کا بشر ہونا اور یہ دعویٰ کہ خدا نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی وحی نہیں اتاری۔ ضد، تعصب اور ہٹ دھری انسانوں کو اس قدر اندھا بنا دیتی ہے کہ وہ خود اپنے مسلمات کا انکار کرنے لگتا ہے چناں چہ یہودیوں نے سیدنا محمد رسول اللہؐ کی دشمنی میں ایک موقع پر نفس رسالت ہی کا انکار کر دیا۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ط (الانعام:۹۱)

"ان لوگوں نے اللہ کی پوری قدر نہ کی جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔"

اس آیت میں انکار وحی و رسالت کو اللہ کی بے قدری قرار دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وحی و رسالت اللہ ہی کی صفات کا تقاضا ہے اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ فی الواقع توحید کے منکر ہیں۔

ان اسباب کا جائزہ

ان وجوہ و اسباب کا گہرا جائزہ لیا جائے اور انکار کی اصل علت دریافت کی جائے تو وہ صرف دنیا پرستی نکلے گی۔ دنیوی زندگی کی محبت اس طرح ان کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی کہ ہر اس معقول سے معقول بات کا انکار کر دیتے تھے جس سے ان کے مفاد دنیا پر زد پڑتی ہو، یہ محض 'قیاس' یا 'ریسرچ' نہیں ہے بلکہ اصل علت کو قرآن نے مختلف اسلوب میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ○ (الدھر:۲۷)

"یہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور انھوں نے ایک بھاری دن (قیامت) کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔"

قرآن عاجلۃ کے لفظ کو آخرۃ کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی محبت ان پر اتنی غالب ہے کہ انھوں نے آخرت کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کے بارے میں کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے۔

انکار رسالت کے ان وجوہ و اسباب میں کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ وہ اس کی ضرورت ہی کا انکار کرتے ہوں۔ اس تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب مشرکین اس کی ضرورت کا انکار نہیں کر سکے تو پھر موحدین کے لیے کس طرح ممکن ہے کہ اس کا انکار کریں۔ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ تعلیم یافتہ مشرک توحید پر تو مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن رسالت کے مرحلے میں آ کر گاڑی رک جاتی ہے، ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ ایسے مطمئن ہو جانے والے لوگوں کی ظاہری سطح کو کرید کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ انہیں توحید کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی توحید بس اتنی ہی ہوگی جتنی فلاسفۂ یونان کی تھی۔

جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ عقل و ہوش رکھنے والا انسان آفتاب کے وجود کا اقرار کرنے کے بعد اس کی روشنی اور گرمی کا انکار کرے اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ سمجھ بوجھ کر شعور کے ساتھ توحید کا اقرار کرنے کے بعد وہ رسالت اور آخرت کا انکار کر سکے۔

ایسے تمام انسان جنھوں نے اپنی انسانیت کو مادہ پرستی کی چھری سے ذبح نہیں کیا ہے، اپنے آپ کو حیوان مطلق کی سطح پر اتار لانا پسند نہیں کرتے ان کے نزدیک انسان کو حیوان سے الگ کرنے والی چیز یہ نہیں ہے کہ انسان، حیوان کے مقابلے میں اپنے حیوانی تقاضوں کو بہتر سے بہتر طور پر پورا کر سکتا ہے۔ یہ عقل انسانی کا انتہائی پست اور غلط استعمال ہے کہ جسم و جسمانیت کو اس کی گروش کا محور و مرکز بنا دیا جائے، وہ جو کچھ سوچے انسان کے مادی وجود ہی کے بارے میں سوچے اور اس کے آگے بڑھ کر سوچنے کی راہ میں نفسانیت کی دیوار حائل کر دی جائے۔ اس کائنات کی پوری ساخت اور خود انسان کی قوتیں، صلاحیتیں اور اس کے ہمہ گیر داعیات و جذبات اس بات پر گواہ ہیں کہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی مخلوق ہے اور اس کا مقصد حیات، حیوانات کے مقصد زندگی سے قطعاً مختلف ہونا چاہیے۔ وہ جانوروں کی طرح کھا پی کر اور نسل کشی کر کے مرجانے کے لیے

پیدا نہیں ہوا اس کا اخلاق وجود صریحاً اس کے مادی وجود سے الگ ہے اور یہی وہ مابہ الامتیاز ہے جس کی بنا پر وہ جانوروں سے اعلیٰ درجہ کی مخلوق قرار پاتا ہے۔ اس کے حرکات وسکنات اور عقائد واعمال کے تمام نتائج کا ظہور اس موجودہ دنیا میں ممکن نہیں، ضروری ہے کہ ایک دوسری دنیا آئے اور وہاں اس کا مکمل اور ابدی ظہور ہو، وہی دوسری دنیا اس کا اصلی گھر اور حقیقی وطن ہے اور وہی دوسری زندگی اس کی ابدی اور لازوال زندگی ہے، اس بات کو قرآن نے اپنے دل کش انداز میں یوں بیان کیا ہے:

وَمَاهٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (العنکبوت:۶۴)

''اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے اور آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے اگر انہیں علم ہوتا۔''

آیت کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اس لائق نہیں ہے کہ انسان اس کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ یہ فانی اور عارضی زندگی ہے اس کی ابدی اور دائمی زندگی آخرت کی زندگی ہے، وہیں کی کامیابی اس لائق ہے کہ اسے مطمح نظر بنایا جائے، دنیا کے کھیل تماشے میں غرق ہوکر رہ جانا اس ابدی زندگی کو تباہ کرنے کے ہم معنی ہے لیکن اس حقیقت پر دھیان دینے کے لیے علم وفہم کی ضرورت ہے جو لوگ اپنے ذہن کا دروازہ بند کرلیتے ہیں وہ دراصل ابدی کامیابی کا دروازہ اپنے لیے بند کردیتے ہیں۔ اس بیان حقیقت سے یہ بات واضح ہوئی کہ انسان کو اپنی حیات ابدی کی بقا اور کامیابی کے لیے بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت دنیوی زندگی کی بقا اور بقائے نوع کی ضرورت سے زیادہ اہم ہے۔ وحی ورسالت دراصل اسی ضرورت کو پورا کرنے والی چیز ہے۔

ضرورت رسالت کا ثبوت ایک اور پہلو سے

وحی ورسالت کی ضرورت ایک اور پہلو سے بھی واضح ہوتی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو عقل دی ہے اس کو نفسانیت اور تعصب سے الگ کرکے صحیح طور پر اگر استعمال کرے تو وہ اجمالی طور پر ان حقائق تک ضرور پہنچ سکتا ہے کہ یہ کائنات آپ سے آپ پیدا نہیں ہوئی اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہ ایک ہی ہوسکتا ہے، اس نے اس کو کھیل اور تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا

بلکہ اس کا ایک انجام ہے اور وہ دوڑا چلا آ رہا ہے اس کا خالق اور پروردگار ہی اس لائق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے کیونکہ سارا اقتدار دراصل اسی کے ہاتھوں میں ہے اور اسی کی خوشنودی انسان کی فلاح وکامرانی کی ضامن ہے۔ یہاں تک تو عقل پہنچا دیتی ہے لیکن اس کی بندگی کیسے کی جائے اس کی خوشی وناخوشی کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے، اس کی ذات وصفات کی تفصیلات کیا ہیں اور اس دنیا میں زندگی گزارنے کا صحیح راستہ کیا ہے؟ ان سوالات تک پہنچ کر عقل سپر رکھ دیتی ہے اور اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیتی ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان کو عقل سے بلند رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اسی رہنمائی کا نام وحی ورسالت ہے ــــ اگر انسان کی یہ سب سے اہم ضرورت پوری نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی حیات ابدی ناکام ہو جائے اور وہ ہلاکت وتباہی کے ایسے گڑھے میں جا گرے جس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔

توحید کا حقیقی مفہوم

یہاں پر رک کر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ توحید، مجرد اس بات کا نام نہیں ہے کہ ایک خدا کا اقرار کر لیا جائے بلکہ توحید کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے اور اس کو اجمالی طور پر تمام خوبیوں سے متصف اور تمام برائیوں اور عیبوں سے پاک مانا جائے، اس کی قدرت، حکمت، رحمت اور عدل وانصاف کا اقرار کیا جائے، اگر کوئی غیر مسلم خدا کو ایک مان لے تو مطمئن نہ ہونا چاہیے کہ اس نے توحید کو مان لیا جب تک وہ خدا کی بنیادی صفات کو بھی تسلیم نہ کرے۔ فلاسفۂ یونان کی اکثریت خدا کو ایک مانتی تھی لیکن واقعہ کے لحاظ سے اس کو توحید کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، چونکہ اس کائنات کے وجود کی توجیہ اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ ایک آخری علت کو تسلیم کیا جائے اس لیے وہ خدا کو محض ایک علۃ العلل کی حیثیت سے مانتی تھی لیکن ان فلاسفہ کا تصور خدا یہ تھا کہ اس نے ایک شے پیدا کر دی اور اس کے بعد اس کا کام ختم ہو گیا اب اس کائنات اور اس کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا کا یہ تصور مشرکین مکہ کے تصور خدا سے بھی گیا گزرا ہے۔

وحی ورسالت کے اثبات پر جو گفتگو کی جا رہی ہے وہ خدا کا ایسا بے معنی تصور رکھنے والوں کو سامنے رکھ کر نہیں کی جا رہی ہے کیونکہ ان کے لیے تو سب سے پہلے توحید پر گفتگو ضروری

ہے۔اب دیکھیے کہ خدا کی توحید کا اقرار کرنے والا جو شخص یہ فیصلہ کرتا ہے کہ انسان کو رسالت و ہدایت کی کوئی ضرورت نہیں، اس کا جس طرح جی چاہے خدا کی عبادت کرے، اسے پوجے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی جو تدبیر چاہے اختیار کرے تو اس کا یہ فیصلہ عقل کا فیصلہ نہیں ہوسکتا بلکہ ایک ایسا فیصلہ ہوگا جو تمام تر عقل کے خلاف ہے۔جو عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا ہے جس نے اسے کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا، جس نے انسان کو مجرد اپنی صفت خالقیت کے مظاہرے کے لیے یہاں نہیں بھیجا کہ اس کا جو جی چاہے کرے اس کے عقائد و اعمال سے کوئی بحث نہ ہو بلکہ انسان اپنے اعمال کی جزا و سزا کا بھی مستحق ہے اور اس کی تخلیق کے پیچھے سنجیدہ مقصد کام کر رہا ہے وہی عقل یہ فیصلہ کیسے کرسکتی ہے کہ انسان کو ہدایت الٰہی کی ضرورت نہیں ہے۔کیا یہ فیصلہ سابقہ فیصلوں کا بالکل عکس اور ضد نہیں ہے؟ کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ کوئی حاکم جو اپنی رعیت کو اپنی ہدایت و قوانین کا پابند نہیں بناتا بلکہ آزادی بخشتا ہے کہ جس کا جو جی چاہے کرے اور پھر جب لوگ اپنی اپنی پسند سے کچھ کر کے اس کے پاس پہنچیں تو وہ کسی سے خوش ہو، کسی سے ناخوش، کسی کو انعام سے نوازے اور کسی کو سزا دے، کسی کو بہشت میں بھیجے اور کسی کو دوزخ میں، کسی کو سورگ عطا کرے اور کسی کو نرک میں جھونک دے۔کیا کسی انسان کے بارے میں بھی یہ تصور قرین عقل ہے؟ کیا عقل اس کا تقاضا نہیں کرتی کہ جزا و سزا کے لیے کوئی قانون ضروری ہے جس کے مطابق مقدمات کے فیصلے کیے جائیں۔ جب کسی انسان کے بارے میں ایسا احمقانہ اور ظالمانہ تصور درست نہیں تو پھر خدا کے بارے میں جس کا عدل بے لاگ اور جس کی رحمت، ماں باپ کی رحمت و شفقت سے بھی زیادہ ہے یہ تصور آخر کسی عقل کی ترازو میں پورا اترے گا؟

جو لوگ خدا کے بارے میں ایسا تصور رکھتے ہیں وہ خود اپنے فیصلوں میں ایسے تضاد و تناقض کا ثبوت پیش کر رہے ہیں جس کے بعد عملاً خدا کا اقرار اور اس کا انکار دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ایسے تمام لوگوں کے بارے میں قرآن کا یہ فیصلہ ناطق ہے۔

وَمَاقَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ (الانعام:۹۱)

''ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔''

وحی کا انکار، خدا کا غلط اندازہ اس لیے ہے کہ دو ہی صورتیں نکلتی ہیں[۱] منکر رسالت کسی انسان پر وحی نازل کرنے کو ناممکن سمجھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کو عاجز قرار دیتا اور اس کی قدرت کا انکار کرتا ہے یا[۲] یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ خدا کی حکمت، رحمت اور عدل کا انکار کرتا ہے۔ ایسا شخص دونوں ہی صورتوں میں اللہ کی بے قدری کرتا ہے۔ یہ بات خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمانیت ورحیمیت سے بالکل میل نہیں کھاتی کہ وہ انسان کی حیات فانی کی بقاو کامرانی کے لیے تو پوری جزرسی کے ساتھ انتظام کرے اور اس کی اخلاقی روحانی اور ابدی زندگی کو ناکام و نامراد ہو جانے کے لیے یوں ہی چھوڑ دے اور اس کے لیے کوئی انتظام نہ فرمائے۔ اس طرح یہ آیت وحی و رسالت کے اثبات پر ایسی محکم دلیل ہے جس کو صرف دھاندلی اور سرکشی ہی رد کرسکتی ہے، معمولی سے معمولی عقل بھی اس کی تردید کی جرأت نہیں کرسکتی۔

عقل انسانی کی نارسائی

یہ بات کہ عقل بطور خود، خدا کی مرضی و نامرضی، خوشی و ناخوشی اور اس کے مطالبات و احکام کو معلوم کرنے سے عاجز ہے، کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے بلکہ دنیا کا ماضی و حال ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ انسان کی عقلیں ایک درجے کی نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان بہت تفاوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن گروہوں نے محض عقل کی بنیاد پر زندگی بسر کرنے کے راستے تجویز کیے ہیں ان کے درمیان بنیادی اور جوہری اختلافات پائے جا رہے ہیں اور یہ اس قدر شدید ہیں کہ دنیا قوموں کے تصادم کی آماجگاہ بن کر رہ گئی ہے۔ امن، چین اور سکون ناپید ہے اور بدامنی و بے چینی کی چڑیلیں ہر طرف ننگی ہو کر ناچ رہی ہیں۔ انسان کو ایسا کوئی نظریۂ حیات نہیں مل رہا ہے جو اس صورت حال کو ختم کرسکے۔ سچا اور صحیح نظریۂ حیات جو انسان کے لیے صحیح راہ عمل متعین کرے۔ عقل کی رسائی سے پہلے بھی باہر تھا اور آج بھی باہر ہے کیونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو عقل دی ہے وہ بہت پھیلنے کے بعد بھی محدود ہے۔ اس کی ایک حد ہے جس کے آگے وہ تنہا نہیں بڑھ سکتی، کسی رہنمائی میں آگے بڑھ سکتی ہے۔ وحی ربانی اور ہدایت الٰہی اسی رہنما کا دوسرا نام ہے۔

صحیح نظریہ حیات اور صحیح راہ عمل سے واقف ہونا کیا انسان کی ضرورت نہیں ہے؟ خود

عقل کا جواب یہ ہے کہ انسان کی یہ سب سے بڑی ضرورت ہے اور اس ضرورت کے مقابلے میں اس کی تمام دوسری ضرورتیں ہیچ ہیں۔ ان تفصیلات سے جو باتیں واضح ہوئیں وہ یہ ہیں:

۱۔ انسان خدا کی ہدایت کا محتاج ہے اور یہ اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

۲۔ اس کو جاننے کا ذریعہ عقل نہیں ہے۔

۳۔ اس کو جاننے کا ذریعہ صرف خدا کی بھیجی ہوئی وحی ہے اور یہ وہ رہنمائی ہے جس کے بغیر عقل ناقص اور نامکمل ہے۔

انسانوں تک پیغامِ خداوندی پہنچنے کا ذریعہ

اب غور کرنا چاہیے کہ انسان تک خدا کا پیغام بھیجنے کا طریقہ اور ذریعہ کیا ہو؟ دو طریقے سمجھ میں آتے ہیں، یا تو خدا تمام انسانوں سے خود مخاطب ہو اور براہِ راست ان تک اپنے احکام پہنچائے یا رسالت کا طریقہ اختیار کرے اور کسی کے توسط سے اپنے احکام بھیجے۔

پہلے طریقے کو خدا نے پسند نہیں کیا ہے اور اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، تاریخ بھی گواہ ہے کہ اس نے کبھی تمام انسانوں کو براہِ راست اپنے احکام نہیں پہنچائے اور آج ہم مشاہدہ بھی کر رہے ہیں کہ وہ اپنے احکام براہِ راست نہیں پہنچا رہا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اس نے یہ طریقہ کیوں پسند نہیں کیا تو اس کی کئی مصلحتیں اور وجہیں ہیں۔

(۱)۔ ہر انسان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے کہ سلطان کائنات کے پیغام کو براہِ راست خود سن اور سمجھ سکے اس کے لیے کچھ مخصوص صلاحیتیں درکار ہیں۔

(۲)۔ اگر ایسا کیا جائے تو انسان کو عقل و اختیار دے کر جس آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے وہ ساری اسکیم ختم ہو جائے، ایمان بالغیب کا کوئی مفہوم باقی نہ رہے۔

(۳)۔ براہِ راست خدا سے حکم سن لینے کے بعد نافرمانی کرے تو فوراً سزا کا مستحق قرار پائے۔ سوچنے، سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت ختم ہو جائے حالانکہ خدا کی حکمت و رحمت دونوں کا اقتضاء ہے کہ انسان کو نافرمانیوں کے بعد توبہ کا اور ٹھوکریں کھانے کے بعد سنبھلنے کا موقع دیا جائے۔ انسان کے بارے میں امہال (مہلت دینا) خدا کی ناقابلِ تبدیل سنت ہے۔

قرآن نے منکرین کے ضد، تعصب اور اس طرح کے احمقانہ مطالبات کے جواب میں ان مصلحتوں کو واضح کر دیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن يَأْتِيَهُمُ ٱللَّهُ فِى ظُلَلٍ مِّنَ ٱلْغَمَامِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ ٱلْأَمْرُ ۚ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ (البقرہ:۲۱۰)

''کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے، فرشتوں کے پرے ساتھ لیے خود سامنے آموجود ہو اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے۔ آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں''

اس آیت نے بتایا کہ وہ حقیقتیں جو پردۂ غیب میں چھپی ہوئی ہیں اس دنیا میں ظاہر نہیں کی جاسکتیں کیونکہ انہیں پوشیدہ حقیقتوں کو سمجھنے، ان پر ایمان لانے اور ایمان کے مقتضیات پر عمل کرنے کے لیے انسان اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اس کی ساری آزمائش ہی اس بات میں ہے کہ وہ ان دیکھی حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے اور ان کانوں سے سن لینے کے بعد عقل و اختیار کی آزمائش کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ جس دن وہ حقیقتیں سامنے آگئیں وہ فیصلہ کا دن ہوگا نہ کہ ایمان و عمل کا۔ اس دن تو بڑے سے بڑا منکر بھی مجبور ہوگا کہ ان پر ایمان لائے۔

اسی بات کو قرآن نے متعدد آیتوں میں بایں الفاظ واضح کیا ہے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيْنَهُمْ۔ (یونس:۱۹)

''اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات طے نہ کر لی گئی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔''

یہ طے شدہ بات، یہی ہے کہ اس نے انسان کو عقل و تمیز دے کر امتحان کے لیے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ کہیں کہا گیا ہے:

فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ
(یونس:۲۰)

''تو ان سے کہو، غیب کا مالک و مختار اللہ ہے، اب تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔''

کہیں فرمایا:

فَمَهِّلِ ٱلْكَٰفِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًۢا (الطارق:۱۷)

"تو آپ کافروں کو کچھ دنوں مہلت دیجیے۔"

براہ راست حکم دینے کے بعد نافرمانی کرنے والوں کے لیے مہلت باقی نہیں رہتی اس کی کئی مثالیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔

شیطان کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست حکم دیا تھا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے، اس نے انکار کیا اور فوراً راندۂ درگاہ قرار پایا۔ خدا کے مقام قرب سے دھکے دے کر نکال باہر کیا گیا۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ط (الاعراف:۱۸)

"کہا نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔"

حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ نے براہ راست حکم دیا تھا کہ ایک متعین درخت کے پھل نہ کھائیں لیکن شیطان کے بہکاوے میں آ کر انھوں نے پھل کھا لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً جنت کے لباس سے محروم کر دیے گئے۔

انبیاء کرام علیہم السلام خدا کے فرماں بردار اور انتہائی مقرب بندے ہوتے ہیں اور غیر معمولی استعداد کی بنا پر عالم غیب سے ان کا تعلق جڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معمولی لغزشوں پر بھی خدا کی طرف سے گرفت ہوتی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام خدا کے حکم کا انتظار کیے بغیر اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیے گئے۔

یہ وجوہ و مصالح ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ پسند نہیں فرمایا کہ براہ راست انسانوں تک اپنے احکام پہنچائے۔

دوسرا طریقہ، رسالت کا طریقہ ہے، اس کے بارے میں پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کس میں خدا کا رسول بننے کی صلاحیت ہے۔ کفار و مشرکین برابر یہ مطالبہ کرتے تھے کہ فرشتے خدا کا پیغام لے کر ہمارے پاس کیوں نہیں آتے، اس مطالبے کے جواب میں اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مطالبہ دو حال سے خالی نہیں۔ فرشتوں کو ان کی اصل صورت و ہیئت میں بھیجا جائے تو بات پھر وہیں آ جاتی جو خدا کے براہ راست کلام میں تھی۔ ملائکہ بھی عالم غیب کی ایک حقیقت ہیں ان کو تمام انسانوں پر منکشف کرنے کے معنی یہ تھے کہ امتحان کی دنیا ختم ہوئی اور فیصلے کی دنیا آ گئی، یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی تھی جب ابھی فیصلے کا وقت نہیں آیا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتوں کو انسان بنا کر بھیجا جاتا تو اس صورت میں لوگ ان کے

بارے میں بھی شک اور التباس میں مبتلا ہو جاتے۔ ان دونوں باتوں کو قرآن نے ایک ہی جگہ بیان کر دیا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ○ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ○ (الانعام:۸،۹)

"اور کہتے ہیں اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل میں اتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔"

ان دو آیتوں سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ فرشتے کو نازل کرنا فیصلہ کرنے اور مہلت ختم ہونے کے مترادف ہے۔ انسانی شکل میں آنے سے شک وشبہہ ختم نہیں ہوگا کیونکہ اس کے لیے پھر کسی فرشتے کی ضرورت پڑے گی جو بتائے کہ یہ واقعی اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔

"اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل میں اتارتے" کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ان کو اصل ہیئت میں دیکھنا ہر انسان کے لیے آسان نہیں۔ کتنے ہی انہیں دیکھ کر خوف و دہشت سے ہلاک ہو جاتے۔

فرشتوں کو انسانی شکل میں پہچاننا عوام تو عوام، خدا کے خاص بندوں کے لیے بھی آسان نہیں ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر، پیغمبر فرشتوں کو انسانی شکل میں نہ پہچان سکے۔ اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک بار حضرت جبریل کو انسانی شکل میں اس وقت پہچان سکے جب وہ رخصت ہو گئے۔ اسی طرح روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار آپ حضرت جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گئے۔ یہ تمام باتیں واضح کرتی ہیں کہ فرشتوں کو تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اب صرف صورت یہ رہ گئی کہ انسانوں کے لیے کسی انسان ہی کو منصب رسالت دیا جائے۔

انسان کی نوعیت تخلیق اور مشیتِ الٰہی

انسانوں کے لیے انسان کو رسول بنانے کی حکمت اور اس کے متعلقات پر گفتگو سے پہلے یہ بات ذہن میں تازہ کر لینی چاہیے کہ انسان نامی مخلوق کی نوعیت تخلیق اور اس کے بارے میں اللہ کی مشیت کیا ہے؟

اس دنیا میں اللہ نے انسان نام کی ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جسے عقل و تمیز کی بے بہا نعمت بھی عطا کی ہے اور اسے بہت سی چیزوں میں تصرف کی قدرت بھی دی ہے، یہ سب دے کر اس کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ وہ عقل و تمیز اور قدرت تصرف کو کس طرح اور کن چیزوں میں استعمال کرتا ہے۔ اس نے صحیح راستہ بھی واضح کر دیا ہے اور غلط راستوں کی بھی نشان دہی کر دی ہے اور یہ بات اس کی پسند پر چھوڑ دی ہے کہ وہ کس راستے کو اختیار کرتا ہے، اس نے غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اگر وہ صحیح راستہ اختیار کرے تو انجام بخیر ہوگا اور برے راستوں پر چلے تو برے انجام سے دو چار ہوگا۔ انسان کے بارے میں اس کی مشیت جبر کی نہیں ہے یعنی وہ اسے نہ خیر پر مجبور کرتا ہے اور نہ شر پر۔ خیر یا شر کا انتخاب خود انسان کو کرنا ہے اور اسی میں اس کی آزمائش ہے۔ انسان جمادات و نباتات و حیوانات کی طرح غیر مکلّف نہیں ہے اور نہ فرشتوں کی طرح معصوم پیدا کیا گیا ہے، ان مخلوقات سے اس کی نوعیت تخلیق مختلف ہے۔ بہت سی حقیقتیں اس کے حواس سے اوجھل کر دی گئی ہیں لیکن ان حقیقتوں تک پہنچنے کے لیے خود اس کے نفس میں اور پوری کائنات میں بے شمار دلائل اور نشانات پھیلا دیے گئے ہیں، اگر وہ اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرے تو ان حقیقتوں تک پہنچ سکتا ہے لیکن اس کو غیر محدود عقل نہیں دی گئی ہے اس لیے اس نے اپنی مرضیات و نامرضیات کو پوری طرح واضح کر دیا ہے تاکہ انسان پر اپنی حجت تمام کر دے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کو خیر پر مجبور کر دینا خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے لیکن اگر وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے بارے میں اپنی مشیت ہی بدل ڈالے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکش اور باغی انسانوں نے جب بھی اس طرح کی باتیں کہی ہیں اس نے اپنی قدرت کا اقرار کیا ہے اور انہیں سمجھایا ہے کہ تمہارے بارے میں میری مشیت جبر کی نہیں ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا

حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ؕ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰی ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ○ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰکُمْ اَجْمَعِیْنَ ○ (الانعام:۱۴۸،۱۴۹)

"یہ مشرک لوگ (تمہاری باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔ ایسی ہی باتیں بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزہ انھوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو، کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو۔ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔ کہو، حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے۔ بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔"

انسان کے ساتھ نفس اور شیطان کے جو دو دشمن لگے ہوئے ہیں وہ ہمیشہ انسان کی نظروں میں اس کے جرائم کی اہمیت کم کرتے رہتے ہیں اور اسے یہ پٹی پڑھاتے رہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تم یہ جرائم نہ کرتے، یہ جو کچھ ہو رہا ہے، خدا کے چاہنے سے ہو رہا ہے۔ تم بے قصور اور بے بس ہو۔ نفس وشیطان کی اس فریب دہی کے جواب میں سب سے پہلے اللہ نے انہیں مجرمین کی تاریخ سے عبرت دلائی ہے کہ تم سے پہلے بھی مجرم اس چیز کو بہانہ بنا کر حق سے انکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میرا عذاب ان پر آ گیا، تم اتنا نہیں سوچتے کہ یہ بات اگر صحیح ہوتی کہ میرے چاہنے سے انہوں نے وہ جرائم کیے تھے تو پھر میں ان پر عذاب کیوں نازل کرتا، کیا تم مجھے ظالم سمجھتے ہو؟ کیا تم میرے عدل وانصاف کا انکار کرتے ہو؟ پھر انہیں یہ بتایا کہ تم بے علمی و جہالت کی بات کہہ رہے ہو۔ تمہارے پاس ظن وتخمین کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پھر آخر میں ان کے سامنے یہ حقیقت رکھ دی کہ بے شک اگر میں چاہوں تو زبردستی تمہیں ہدایت دے دوں لیکن تمہارے بارے میں میری یہ مشیت نہیں ہے۔ تم اگر میری حکمت، رحمت اور عدل وانصاف کو سامنے رکھتے تو اپنے گندے عقاید واعمال کے لیے کبھی یہ جاہلانہ عذر پیش نہ کرتے، تم اپنے اختیار اور اپنی پسند سے ہدایت قبول کرنا نہیں چاہتے تو گمرہی میں پڑے رہو، تمہارے اس جاہلانہ عذر کی وجہ سے میں اپنی مشیت میں تبدیلی نہیں کروں گا۔

انسانوں پر اتمام حجت کے لیے رسالت ضروری ہے

انسان کی نوعیتِ تخلیق اور اس کے بارے میں اللہ کی مشیت کا علم ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ انسانوں کے لیے اگر انسان ہی کو رسول نہ بنایا گیا ہوتا تو نہ انسان ہدایت یافتہ ہوتا اور نہ اس پر خدا کی حجت پوری ہوتی، اس کو ہدایت کی راہ دکھانے اور حجت تمام کرنے کے لیے ضروری تھا کہ منتخب انسانوں ہی کو رسالت ونبوت کا منصب عطا کیا جائے۔ یہ بات کہ رسولوں کو بھیجنے کی غرض اتمام حجت ہے قرآن کی متعدد آیتوں میں بیان ہوئی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (آیت:۱۶۵)

”یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے اور اللہ غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔“

یہ آیت واضح الفاظ میں بتاتی ہے کہ رسولوں کو مبعوث کرنے کی غرض اتمام حجت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے سامنے ہدایت وضلالت، ثواب وعذاب، نیکی وبدی، خیر وشر کو اس طرح کھول دیا ہے کہ کوئی مجرم یہ عذر نہیں کر سکتا کہ میں حقیقت حال سے ناواقف تھا، انسان کے اس عذر جہالت کو ختم کرنے ہی کا نام اتمام حجت ہے۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں یوں کہا گیا ہے:

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ (الانعام:۱۳۱)

”یہ اس لیے کہ تمہارا رب، بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کرنے والا نہیں جب کہ ان کے باشندے ناواقف ہوں۔“

اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں کہ گناہ گاروں کو ان کے گناہوں سے آگاہ کیے بغیر دنیا یا آخرت میں انہیں سزا دے۔ وہ پہلے اچھی طرح واضح کر دیتا ہے کہ دیکھو، یہ گناہ ہے، ان باتوں سے میں ناخوش ہوتا ہوں، یہ زندگی بسر کرنے کا غلط طریقہ ہے، یہ باتیں تمہیں میرے عذاب میں گرفتار کر دیں گی اور جب بار بار کی تنبیہ کے باوجود، مجرمین اپنے جرائم سے باز نہیں آتے تو وہ سزا

کے مستحق ہو جاتے ہیں اور ان کے لیے عذر کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ ایک جگہ اور فرمایا:

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۞ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۞ (الشعراء: ۲۰۸-۲۰۹)

”اور ہم نے کوئی بستی غارت نہیں کی جس کے لیے ڈرانے والے نہ تھے، یاد دلانے کو، اور ہمارا کام ظلم کرنا نہیں ہے۔“

رسولوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو قوانین بھیجے ہیں وہ جس طرح اتمام حجت ہیں اسی طرح اتمام نعمت بھی ہیں، اس نے نافرمانوں کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہنے دیا اور فرماں برداروں پر اپنی نعمت تمام کر دی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ: ۳)

”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔“

اگر انسانوں تک قوانین الٰہی کا صرف پہنچ جانا کافی ہوتا تو اس کے لیے آسمان سے ایک کتاب اتار دی جاتی، یا کسی فرشتے کو بھیج کر کتاب الٰہی کی تلاوت کرا دی جاتی لیکن یہ صورت اتمام حجت اور اتمام نعمت کی ہرگز نہ ہوتی۔ انسان فرشتوں کی طرح کوئی مجرد اور بسیط وجود نہیں ہے بلکہ متنوع ومتضاد قوتوں، صلاحیتوں، خیالات، جذبات، داعیات اور امیال وعواطف کی انتہائی پیچیدہ مشینری ہے۔ اس کو ٹھیک طور پر، صحیح سمت میں متحرک کرنے کے لیے نہ مجرد کوئی کتاب کافی ہوسکتی تھی اور نہ کوئی ایسا وجود کافی ہوسکتا تھا جسے اس پیچیدہ مشینری کا براہ راست علم نہ ہو بلکہ ضروری تھا کہ انسانوں ہی میں سے کسی قابل ترین انسان کو رسالت کا عظیم منصب عطا کیا جائے تا کہ وہ خدا کی دکھائی ہوئی سیدھی راہ پر خود چل کر اور احکام خداوندی پر خود عمل کر کے لوگوں کے سامنے ایک ایسا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا نمونہ پیش کر دے جسے لوگ اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ یہ ہے خدا کی وہ بندگی واطاعت جس کا ان سے مطالبہ ہے اور یہ ہے خدا کا بھیجا ہوا وہ دین جسے اس نے اپنی پسندیدگی کی سند عطا کی ہے اور اسے اختیار کیے بغیر کوئی شخص اس کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکتا، انسان کو منصب رسالت عطا کرنے کی یہی وہ حکمت ہے جسے مختلف انداز میں اللہ کی کتاب نے واضح کیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۝ (بنی اسرائیل:۹۵)

"ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور کسی فرشتے کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔"

یہ بات کہ اگر زمین پر فرشتے چل پھر رہے ہوتے تو کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجا جاتا اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ خدا کے رسول اور اس کے مخاطبین کا ہم جنس ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جس کو رسالت کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے سمجھ لینا چاہیے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ایک تو ہوتا ہے نظریہ اور دوسری چیز ہوتی ہے اس نظریے کا عملی انطباق۔ نظریات ذہنی و علمی ادراکات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر مقصود محض اپنی ذہنی صلاحیتوں کی نمائش ہو تو انہیں سنا دینا یا زیادہ سے زیادہ انہیں الفاظ کا لباس پہنا دینا کافی ہوگا لیکن اگر مقصود یہ ہو کہ وہ نظریات سراپردۂ ذہن سے نکل کر عالم واقعہ میں جلوہ گر ہوں تو اس کے لیے ان نظریات کا عملی انطباق اور ان کی تشریح وتوضیح لازمی ہے۔ کیا کوئی شخص طب، ڈاکٹری اور قانون کی صرف اصولی کتابیں پڑھ کر قابل اعتماد طبیب، مستند ڈاکٹر اور ماہر وکیل ہو سکتا ہے؟ جب انسانی اصول و قوانین کے لیے ان کی تشریح وتوضیح اور ان کا عملی انطباق ضروری ہے تو خداوندی اصول وقوانین کے لیے ان کی تشریح وتوضیح اور ان کا عملی انطباق بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا۔ اس مشاہدے اور تجربے کو سامنے رکھ کر معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے جو ضابطے اور قوانین نازل کیے ہیں ان کا عملی انطباق کسی فرشتے کے بس کی بات نہیں ہے۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ اللہ نے انسان کی گھریلو اور عائلی زندگی کے لیے جو قوانین بھیجے ہیں، کیا کوئی فرشتہ، فرشتہ رہتے ہوئے ان کی عملی تشریح اور ان کے عملی انطباق پر قادر ہے؟ اب اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کو رسول نہ بناتا تو انسانی زندگی کے شاخ در شاخ معاملات میں اس کے قوانین کی علمی و عملی تشریح کون کرتا اور کس طرح انسان ان معاملات میں خدا کی رضا اور اس کے منشاء کو پا سکتا؟ ایسی صورت میں نہ تو اتمام حجت ہو سکتا تھا اور نہ اتمام نعمت اور اس طرح رسولوں کے مبعوث کرنے کی اصل غرض ہی فوت ہو کر رہ جاتی، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنے احکام کو صرف پڑھ کر سنا دینا کافی نہ سمجھا بلکہ اپنے رسول پر اس کی تبیین اور توضیح کی ذمہ داری بھی ڈالی۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ○ (النحل:۴۴)

"اور تم پر یہ ذکر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور وفکر کریں۔"

رسولوں پر صرف زبانی تبیین وتوضیح کی ذمہ داری نہ تھی، ان کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے عمل سے اس کی تشریح کریں۔ اس لیے اس نے صرف اپنی اطاعت کا مطالبہ نہیں کیا رسولوں کی اطاعت کا بھی مطالبہ کیا بلکہ ان کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت قرار دے کر یہ تک کہہ دیا کہ رسول بھیجے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے رسول کی زندگی کو دوسروں کے لیے نمونہ اور اسوہ کی حیثیت دی ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (احزاب:۲۱)

"اور تمہارے لیے رسول کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے۔"

یہ بات احزاب کی انتہائی خطرناک جنگ کے پس منظر میں کہی گئی ہے اور مسلمانوں کے سامنے رسول خداؐ کا نمونہ پیش کیا گیا ہے کہ دیکھو، جنگ کی ان سختیوں میں ان کا کیا حال ہے، کس طرح وہ استقلال واستقامت کی ناقابل شکست چٹان بنے ہوئے ہیں اور اللہ کے وعدوں پر انہیں کس درجے کا یقین حاصل ہے۔ تمہیں بھی چاہیے کہ زندگی کے تمام معاملات میں انہیں کو اپنا اسوہ اور نمونہ بناؤ۔

اس آیت نے بھی اچھی طرح یہ بات واضح کی کہ رسول صرف اس لیے مبعوث نہیں کیے جاتے کہ بس خدا کا حکم سنا کر الگ ہو جائیں بلکہ نازک سے نازک وقت میں بھی انہیں اپنا عملی نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو خدا کی حجت بندوں پر تمام نہ ہو اور نہ صحیح طور پر وہ احکام خداوندی پر عمل پیرا ہو سکیں۔

ایک اور پہلو سے اس مسئلے پر نظر ڈالیے۔ انسان نے خدا کی ہدایات کو فراموش کر کے یا اپنی خواہشات نفس کی تکمیل کے لیے طرح طرح کے مذاہب ومسالک ایجاد کر رکھے تھے اور وہ صراط مستقیم اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی جو خدا نے اسے دکھائی تھی۔ ان بے شمار اختلافات کو ختم کر کے کسی نقطۂ اتحاد پر سب کو جمع کرنا کیا اس طرح ممکن تھا کہ بس ان کے کانوں تک یہ آواز

پہنچادی جاتی کہ دیکھو، یہ بات غلط ہے اور یہ صحیح ہے، کیا صرف آواز کو سن کر ان کے اختلافات ختم ہو جاتے اور وہ سب پھر سیدھی راہ پر اکٹھا ہو جاتے؟ ایسا کبھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کام کے لیے بھی ضروری تھا کہ ایک انسان کامل اپنے قول اور عمل دونوں سے ان کے سامنے حق کی راہ واضح کرتا اور ان کے اختلافات کی حقیقت ان پر کھولتا۔ عقل فیصلہ کرتی ہے کہ اس کے بغیر اختلافات ختم نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ کتاب حق کے ساتھ ایک رسول بھی مبعوث فرماتا ہے جو اپنے قول و عمل سے ان اختلافات کی حقیقت لوگوں پر واضح کر دے۔ سورۂ نحل کی جو آیت اوپر لکھی گئی ہے اس سے ایک رکوع آگے یہ آیت موجود ہے:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ (آیت: ۶۴)

"ہم نے یہ کتاب تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت ان پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں۔"

کفار و مشرکین کو چھوڑیے آج مسلمانوں نے خود جو طرح طرح کے مذاہب گھڑ رکھے ہیں اور حقیقت پر انھوں نے جو پردے ڈال دیے ہیں کیا وہ چاک ہو سکتے تھے اگر رسول کا عملی نمونہ محفوظ نہ ہوتا؟ یہ رسول کا عملی نمونہ ہی ہے جو ہمیں خدا کی اصل ہدایت تک پہنچاتا اور ہم پر اختلافات کی حقیقت واضح کرتا ہے۔

اس تفصیل سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ انسانوں کے لیے انسان ہی کا رسول بنایا جانا ضروری تھا۔ کسی ماوراء بشریت ہستی میں انسانوں کے لیے رسول بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اور دوسری یہ کہ رسول کی تبیین و تشریح اور عملی نمونے کو بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو خود کتاب الٰہی کو حاصل ہے اور جو لوگ رسول کی تبیین و تشریح اور اس کے عملی نمونے کو اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے وہ حقیقت رسالت سے اسی طرح ناآشنا ہیں جس طرح وہ لوگ ناآشنا تھے جن کے نزدیک کسی انسان کا رسول ہونا سخت حیرت خیز اور تعجب انگیز بات تھی۔

رسالت اتمام نعمت بھی ہے

یہ بات عقلی دلائل سے ثابت ہو چکی ہے کہ انسان، اللہ کی ہدایت کا محتاج ہے اور اللہ کی ہدایت اور اس کی مرضیات کا علم رسالت کے بغیر ممکن نہیں اور عقل اس بات سے انکار کرتی ہے کہ خدائے رحمٰن و رحیم نے انسان کی ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو، یقیناً اس نے اس کا انتظام کیا ہے بلکہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے بندوں کے جسمانی آرام وآسائش کے لیے اپنی نعمتوں کا جو مینہ برسایا ہے، اس کی غرض وغایت دراصل یہ ہے کہ وہ اس کے روحانی انتظام سے فائدہ اٹھائے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کر کے اپنی روحوں کی کھیتیاں سرسبز وشاداب کرے کیونکہ انسانوں کی ابدی اور لازوال زندگیاں اس کے بغیر کامیاب وبامراد نہیں ہوسکتیں۔ سورۂ نحل میں چند انعامات کا ذکر کر کے آخر میں فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ○ (آیت:۸۱)

''اور اسی طرح تم پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تا کہ تم اس کا حکم مانو۔''

انسان کی مادی وجسمانی ضروریات کی ایک فہرست بنائیے اور ہر شعبے سے متعلق تحقیقات کر کے دیکھیے کہ اس نے کس اہتمام سے اپنی نعمتوں کی تکمیل کی ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے شعور کے ساتھ اگر انسان یہ تحقیقات کرے تو تنہا یہی چیز اس عظیم انتظام کی طرف رہنمائی کے لیے کافی ہے جو خدا نے اس کے روحانی داعیات وضروریات کی تکمیل کے لیے کر رکھا ہے۔

یہ بات بھی منقح ہو چکی ہے کہ انسانوں تک خدا کے احکام پہنچانے کے لیے کسی انسان ہی کا رسول ہونا ضروری ہے۔ اب دیکھ لینا ہے کہ کیا واقعی دنیا میں خدا کے رسول آتے رہے ہیں یا نہیں؟ تاریخ اس سوال کا جواب اثبات میں دیتی ہے۔ دنیا میں خدا کے پیغمبروں کا آنا ثابت شدہ حقیقت ہے اور آج بھی دنیا کی عظیم اکثریت اسے تسلیم کرتی ہے اور دنیا کی سب سے زیادہ سچی کتاب کی گواہی تو ایسی ہے جس سے انکار کی عقلاً کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اللہ کی یہ آخری کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کی ہر امت کے لیے رسول آتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ سیدنا محمد رسول اللہؐ پر ختم ہو چکا ہے۔

رسولوں اور قوموں کی تاریخ سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ چند ٹکڑے ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ○ (یونس:۴۷)

''ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی امت کے پاس رسول آجاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے۔ اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔''

سورۂ نحل میں فرمایا:۔

وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ

(آیت:۳۶)

"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔"

سورۂ رعد میں ہے:

اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِکُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ۝ (آیت:۷)

"تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔"

سورۂ فاطر میں ارشاد فرمایا:

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ؕ وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ ۝ (آیت:۲۴)

"ہم نے تمہیں سچا دین دے کر بھیجا بشارت اور ڈراوا سنانے والا، اور کوئی امت نہیں جس میں کوئی ڈراوا سنانے والا گزر نہ چکا ہو۔"

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہزاروں انبیاء اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر نام بنام قرآن میں موجود ہے اور بہتوں کا ذکر ان کے اسماء کے بغیر کیا گیا ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوا:

وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَیۡکَ ؕ (آیت:۱۶۴)

"ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔"

سورۂ مومن میں کہا گیا:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَیۡکَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَیۡکَ ؕ (آیت:۷۸)

"اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ان میں سے بعض وہ ہیں جن کے

حالات ہم نے تمہیں سنائے اور بعض وہ ہیں جن کے حالات تمہیں نہیں سنائے۔''

انبیاء کرام کا سلسلۃ الذہب سیدنا محمد رسول اللہؐ پر ختم کر دیا گیا:

مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ؀ (الاحزاب:۴۰)

''تمہارے مردوں میں محمد کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن اللہ کے رسول اور تمام انبیاء کے خاتم ہیں اور اللہ تمام چیزوں کا علم رکھتا ہے۔''

اجمالی طور پر انسانوں کے لیے رسولوں کی بعثت، انسانوں کی اکثریت کے نزدیک ایک حقیقت مسلمہ ہے۔ جہاں متعین طور پر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کو جہاں کروڑوں انسان تسلیم کرتے ہیں وہاں کروڑوں اس کے منکر بھی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر نبوت محمدیؐ سے متعلق یہاں چند دلائل پیش کیے جائیں۔

(ماہ نامہ زندگی رام پور، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۶۱ء)

رسالت محمدیؐ کا ثبوت

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا جو لوگ ثبوت مانگتے ہیں وہ دراصل اس بات کا ثبوت طلب کرتے ہیں کہ خدا نے کسی انسان کو اپنا رسول بنایا بھی ہے یا نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ کی نبوت ورسالت ثابت نہ ہو تو آج دنیا میں کسی ایک نبی کی نبوت بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اپنے آخری نبی کی نبوت پر جو دلیل عطا کی وہ صفحہ عالم پہ اس طرح نقش ہے کہ قیامت تک کوئی اسے مٹا نہیں سکتا۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی نبوت ورسالت پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت میں شک کرتے ہیں تو واقف حال حیران رہ جاتا ہے حالانکہ صورت واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ کی نبوت ورسالت میں ایک درجہ شک کی گنجائش ہو تو ان مذکورہ بالا انبیاء کی نبوت ورسالت میں سو درجہ شک کی گنجائش نکل آئے گی۔ فی الواقع یہ نبوت محمدیؐ کا احسان ہے کہ اس نے ان انبیاء کی نبوت کو بھی حتمی اور قطعی بنا دیا ہے۔ احسان ماننے کے بجائے آپ کی شخصیت پر پھبتیاں اڑانا اور جان بوجھ کر آپ کی نبوت میں شک پیدا کرنا، انتہائی درجہ کی ناشکری ہی نہیں ہے۔ پرلے درجے کی حماقت بھی ہے۔ اس لیے کہ اس غیر معقول رویے سے صرف اس گروہ کو فائدہ پہنچتا ہے جو ہر آسمانی دین کے انکار پر تلا ہوا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو ایک طرف دیوتاؤں، دیویوں اور اوتاروں پر عقیدہ رکھتے ہیں جس کی پشت پر کوئی دلیل و برہان موجود نہیں ہے اور دوسری طرف نبوت محمدی میں شک کرتے ہیں جو ناقابل انکار دلائل سے مدلل ہے تو واقف حال کو بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ نے ہر قوم اور ہر ملک میں اپنے رسول بھیجے ہیں۔ اس کی ہدایت کا نور ہر افق پر چمکا اور اس کے پیغام کی ابدی و سرمدی

صدا ہر ملک میں گونجی ہے۔ یہ اعلان ثابت کرتا ہے کہ ہندستان میں بھی خدا کی آواز گونجی ہوگی اور یہاں بھی اس کے قاصد اور رسول آئے ہوں گے۔ اس اعلان حقیقت کا تقاضا آیا یہ ہے کہ برادران وطن کو قرآن اور اس کی تعلیمات پر غور و فکر کرنا چاہیے یا یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبر قرآن کا بغیر کسی معقول دلیل کے انکار کر دینا چاہیے؟

انبیاء کرام علیہم السلام کے مقدس گروہ میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آج بھی دنیا میں آپ کی دلیل نبوت موجود ہے جسے ہاتھوں سے چھوا، آنکھوں سے دیکھا اور زبانوں سے پڑھا جا سکتا ہے اور جسے اپنے سینوں میں محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ یہ امتیاز آپ کو اس لیے عطا کیا گیا کہ قیامت تک پھر کوئی نبی آنے والا نہ تھا آپ سلسلۂ نبوت کے خاتم تھے۔ ایک طرف آپ نے انبیاء سابقین کی نبوت و رسالت کی تصدیق فرمائی اور دوسری طرف منصب نبوت و رسالت پر مہر لگا کر ہمیشہ کے لیے اسے بند کر دیا۔

آپ کی نبوت و رسالت کو ثابت کرنے والا، دائمی اور قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ قرآن مجید ہے۔ نبوت محمدی کی جس قدر معقول و منقول دلیلیں موجود ہیں ان سب کا ماخذ یہی ایک دلیل ہے۔ یہ ایک دلیل دراصل بیسیوں آفاقی، انفسی، عقلی، تاریخی اور تجربی دلائل و براہین کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت محمدی کے منکرین کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ پیش کیا ہے انہیں حسب ذیل چھ اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نبوت محمدی کے اثبات کے لیے خود قرآن کو بطور دلیل و شاہد پیش کرنا۔
(۲) قرآن کے وحی الٰہی ہونے پر دلائل (۳) وسیع کائنات کے بعض اجزاء کی شہادت۔
(۴) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل نبوت چالیس سالہ زندگی سے استشہاد (۵) نبوت کے بعد دعوت اسلامی کے بنیادی نکات اور آپ کے فکر و عمل اور اخلاق و کردار سے استشہاد۔ (۶) انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کی تاریخ سے استشہاد۔

رسالت محمدی کی سب سے بڑی دلیل قرآن ہے

جس طرح اللہ نے توحید و آخرت کے اثبات کے لیے آفاق و انفس کی بہت سی چیزوں کو پیرایۂ قسم میں بطور شاہد و دلیل پیش کیا ہے۔ اسی طرح نبوت محمدی کے اثبات کے لیے عظیم ترین معجزہ۔ قرآن کریم کی قسم کھا کر اسے آپ کے دعویٰ نبوت کی صداقت کے لیے بحیثیت شاہد و دلیل

پیش کیا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دعویٰ نبوت و رسالت میں سچا ثابت کرنے کے لیے اس کائنات میں قرآن سے بڑی کوئی محسوس و مشاہد دلیل موجود نہیں ہے۔ سورۂ یٰسٓ کی ابتدا درجہ ذیل آیات سے کی گئی ہے۔

یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ (آیات:۱۔۵)

"یٰسٓ قرآن کریم اس بات پر گواہ ہے کہ بلاشبہ تم خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہو، سیدھی راہ پر ہو۔ زبردست اور مہربان ہستی نے نازل کیا ہے۔"

یہ قرآن جو ایک طرف بڑی مضبوط و محکم بنیاد پر قائم اور دوسری طرف بے مثال حکمتوں سے معمور ہے، شہادت دے رہا ہے کہ تم اسی طرح خدا کے رسول ہو جس طرح تم سے پہلے اس نے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ یہ قرآن جو نہ محض شاعرانہ پرواز تخیل ہے، نہ بے بنیاد کہانت، بلکہ ناقابل انکار حقیقتوں سے بھری ہوئی ایک لاجواب کتاب ہے۔ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ تم گمراہی و ضلالت کے ہر شائبے سے پاک اور ٹھیک اس صراط مستقیم پر چل رہے ہو جو خود خدا نے تمہیں دکھائی ہے۔ اس قرآن کی ایک ایک آیت پکار رہی ہے کہ میں کسی انسان کا کلام نہیں ہوں بلکہ خدائے عزیز و رحیم کا کلام ہوں جسے اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطہر قلب پر اتارا ہے اور جسے ان کی پاک زبان ٹھیک اسی طرح سنا رہی ہے جس طرح وہ اتارا گیا ہے ——— قرآن کی شہادت، کسی معمولی کتاب کی شہادت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی کتاب کی شہادت ہے جو حکیم یعنی ہر جہت سے محکم و استوار اور حکمتوں سے پر ہے۔ کسی شے کی قدر و قیمت اور حقیقت اس کی صفات و خصوصیات سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں خود قرآن کے لیے جن صفات و خصوصیات کا ذکر موجود ہے ان سب کی مکمل فہرست تیار کرنے کا موقع تو نہیں ملا لیکن سرسری نظر ڈالنے سے بھی ذیل کے الفاظ سامنے آئے۔

حکیم، کریم، عظیم، مجید، عزیز، مبین، منیر، شفا، رحمت، ہدایت، نور، ذکر، ذکریٰ، تذکرہ، موعظۃ، بصائر، مبارک، مصدق، مہیمن، روح۔

قرآن کھولتے ہی ہماری نگاہوں کے سامنے اس کی ایک ایسی خصوصیت اور ایک صفت جلوہ گر ہوتی ہے جو اسے دنیا کی تمام دوسری کتابوں سے ممتاز کر دیتی ہے۔

الٓمّٓ ۚ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۛۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ

(البقرہ:۱،۲)

"الٓمّٓ، یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔"

قرآن کے سوا دنیا کی کون سی کتاب ہے جسے لاریب فیہ کی خصوصیت حاصل ہو اور جو ضلالت و گمرہی سے پاک، ھدی للمتقین کی صفت سے متصف ہو۔ اس کتاب کی دوسری خصوصیت جو پہلی ہی خصوصیت کا نتیجہ ہے یہ ہے:

لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ (حٰم السجدہ:۴۲)

"کسی سمت اور کسی جہت سے بھی اس کتاب میں باطل کا دخل نہیں ہے۔"

جو کتاب ہر شک و شبہہ سے پاک، سراپا ہدایت اور غلطی و کذب کے ہر اندیشے سے بری ہو کیا اس کی شہادت معمولی اور بے وزن شہادت ہو سکتی ہے؟ ایک ایسے کلام کی شہادت بھی اگر مخاطبین کو مطمئن نہیں کرتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مطمئن ہونا چاہتے ہی نہیں۔ دوسرے مقام پر پھر فرمایا:

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ

(قٓ:۱،۲)

"قٓ، قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی۔ بلکہ انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہیں میں کا ایک ڈر سنانے والا آیا۔"

بزرگی اور عظمت و شان والا قرآن خود اس بات پر دلیل ہے کہ تم خدا کے رسول برحق ہو، تمہاری رسالت میں کوئی شک نہیں، جو لوگ تمہاری رسالت کا انکار کر رہے ہیں ان کے پاس انکار کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ جہل و نادانی کی وجہ سے وہ اس پر متعجب ہیں کہ انہیں میں کا ایک آدمی خدا کا رسول کیسے بن گیا۔

ٹھیک یہی بات سورۂ صٓ کی ابتدا میں کہی گئی۔

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ؕ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ

(آیت:۱،۲)

"صٓ، قسم ہے اس قرآن ناصح کی، بلکہ انکار کرنے والے غرور اور عناد و مخالفت میں مبتلا ہیں۔"

یہ نصیحتوں اور یاد دہانیوں سے پر، تبلیغ وتاثیر کا شاہکار قرآن، نبوت محمدی کی صداقت پر گواہ ہے اور انکار کرنے والے، جاہلانہ غرور اور معاندانہ مخالفت کے جوش میں اس نبوت ورسالت کا انکار کر رہے ہیں۔

قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے دلائل

قرآن کو نبوت محمدی کی صداقت کے لیے شاہد اور دلیل بناتے ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قرآن کی جو صفات وخصوصیات ذکر کی گئی ہے وہی اس حقیقت تک پہنچ جانے کے لیے کافی ہیں کہ یہ کسی انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتی لیکن یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے صرف اس جواب پر بس نہیں کیا بلکہ اس دعوے پر متعدد جہتوں سے دلائل پیش کیے تاکہ حجت پوری ہو جائے اور کسی کے پاس عذر انکار باقی نہ رہے۔ سب سے پہلی چیز جو قاری کے ذہن کو چونکاتی ہے وہ پر زور اور شاہانہ انداز میں اس دعوے کی تکرار ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور اسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اسے اتارا ہے۔ اوپر سورہ یٰسٓ کی جو آیات پیش کی گئی ہیں ان میں کی ایک آیت تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ میں بھی یہی دعویٰ کیا گیا ہے۔ آیئے ہم سب سے پہلے یہی دیکھ لیں کہ قرآن میں یہ دعویٰ نوبہ نو انداز میں کتنی دفعہ دہرایا گیا ہے۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ اس تکرار کی غرض صرف تاکید نہیں ہے بلکہ ہر جگہ دعوے میں ایک دلیل بھی چھپی ہوئی ملے گی۔ یہاں بھی العزیز اور الرحیم کے اسمائے حسنیٰ، دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ العزیز (زبردست اور غالب) تو اس حقیقت کو ثابت کر رہا ہے کہ خدا کی سلطنت میں کوئی نہیں ہے جو اس کے ارادے کی تکمیل میں حائل اور مانع بن سکے۔ اس کائنات میں خدا کی مزاحم طاقت سرے سے موجود ہی نہیں ہے، وہ اگر اپنے کسی بندے پر اپنا کلام نازل کرنا چاہے تو یہ بات اس کے دائرۂ قدرت کے اندر ہے۔ اب اگر کوئی شخص نزول وحی کا انکار کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی قدرت کا انکار کر رہا ہے۔ الرحیم اس بات کی دلیل ہے کہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی اور ہدایت کے لیے کتاب نازل کرنا اور رسول مبعوث کرنا اس کی رحمت کا تقاضا ہے اور یہ بات اس کی رحمت سے بعید ہے کہ وہ انسانوں کو زندگی کے تاریک جنگل میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے۔ اب اگر کوئی شخص کتاب الٰہی اور رسالت کا انکار کرتا

ہے تو دراصل وہ خدا کی رحمت کا انکار کر رہا ہے۔ یہی دعویٰ سورۂ سجدہ کی اس آیت میں ہے:

الٓمّٓ ۚ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِينَ ؕ

(آیات:۱، ۲)

"یہ کتاب رب العلمین کی طرف سے اتاری گئی ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بندوں کی ہدایت کے لیے قرآن نازل کرنا پروردگار عالم کی ربوبیت کا تقاضا ہے، جس کی ربوبیت نے انسان کی مادی اور جسمانی زندگی کی تمام ضروریات پوری کی ہیں اور ہر آن وہ ان کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔ کیسے ممکن تھا کہ وہ انسان کی روحانی زندگی کی ضرورت پوری نہ کرتا جب کہ روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضرورت، مادی زندگی کی ضرورت سے زیادہ اہم ہے۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اس نے انسان کی یہ اہم ترین ضرورت پوری نہیں کی ہے تو فی الواقع وہ خدا کی ربوبیت کبریٰ کا انکار کر رہا ہے۔ سورۂ زمر میں فرمایا:

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ (آیت:۱)

"یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔"

العزیز کی صفت ایک طرف تو یہ بتاتی ہے کہ قرآن کا نزول اس کی قدرت کاملہ کے تحت ہوا ہے اور کوئی اسے روک نہیں سکتا تھا اور دوسری طرف یہ بھی واضح کرتی ہے کہ کسی میں یہ دم خم نہیں جو اس کتاب کے نفاذ کو روک دے۔ یہ کتاب معاندین کی تمام مخالفتوں کے باوجود نافذ ہو کر رہے گی۔ سورۂ مومن میں کہا:

حٰمٓ ۚ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۙ (آیت:۱، ۲)

"یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو عزیز اور علیم ہے۔"

یہاں علیم کی صفت تنبیہ کرتی ہے کہ علم اس کی ذاتی صفت ہے اور تمام کائنات کو محیط ہے اس لیے اسی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے قانون بنائے۔ اسی کا قانون صحیح اور ہر خلل سے پاک ہو سکتا ہے۔ کم علم انسان خود جو قانون بھی بنائے گا، ناقص ہوگا اور خلل سے پاک ہرگز نہ ہوگا۔ سورۂ حٰم السجدہ ہے:

حٰمٓ ۚ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۚ (آیت:۱، ۲)

"یہ رحمٰن اور رحیم کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔"

اسی سورۃ میں ایک جگہ اور ہے تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ ۝ "یہ حکیم اور حمید کی اتاری ہوئی کتاب ہے" حمید کا لفظ جب اللہ کی صفت بنتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ محمودیت اس کی ذاتی صفت ہے۔ اس کی اپنی ذات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تمام اچھے صفات سے متصف اور تمام برے صفات سے بری ہو۔ اس صفت کا استعمال اس جگہ یہ بتا رہا ہے کہ اگر وہ قرآن نازل نہ کرتا تو یہ بات اس کے لیے نقص وعیب ہوتی اور وہ ہر نقص وعیب سے پاک ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ۝ؕ (آیت:۴)

"یہ کتاب اس خدا کی طرف سے اتاری گئی ہے جو زمین اور بلند آسمانوں کا خالق ہے۔"

ان متعدد صفات حسنیٰ کا ذکر یہ بتاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کرنا خدا کی ان صفات کا تقاضا ہے، اگر کوئی شخص خلوص کے ساتھ خدا کو ان صفات سے متصف مانتا ہے تو آخر کس بنیاد پر وہ خدا کی طرف سے قرآن کے نزول کا انکار کرے گا؟ اس کی خالقیت، ربوبیت، رحمت، قدرت، علم وحکمت اور ذاتی طور پر تمام صفات حمیدہ سے اتصاف اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کتاب حق نازل کی ہے۔ اگر وہ یہ کتاب نازل نہ کرتا تو اس کی ربوبیت مطلقہ اور رحمت عامہ میں نقص پیدا ہو جاتا حالانکہ اس کی ذات ہر شائبۂ نقص سے پاک ہے۔ ان آیتوں کے علاوہ متعدد آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں بہ انداز شاہانہ، انزال قرآن کی نسبت اپنی طرف کی گئی ہے۔ سورۂ دہر میں فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا ۝ؕ (آیت:۲۳)

"بلاشبہ ہم نے قرآن کو تم پر بتدریج نازل کیا ہے۔"

سورۂ حجر میں کہا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (آیت:۹)

"ہم نے یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں۔"

یہ کسی انسان کا گھڑا ہوا ذکر نہیں ہے بلکہ ہم نے اسے نازل کیا ہے اور کسی انسان کی مجال نہیں کہ اسے مٹا یا دبا سکے اور نہ کسی کے بس کی بات ہے کہ اس میں تحریف کر سکے اس لیے کہ ہم خود اس کے نگہبان اور محافظ ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا:

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ (آیت:۱۰۵)

"اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے۔"

"اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے" اس بات کی ضمانت ہے کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک بحفاظت تمام ٹھیک اسی طرح پہنچ گیا ہے جس طرح ہم نے اسے نازل کیا، راستے میں ذرہ برابر اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ دوسری جگہ اس کے بحفاظت پہنچنے کی صورت یہ بتائی:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؁ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ؁ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ؁ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ؁ (الشعراء:۱۹۲۔۱۹۵)

"یہ قرآن پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے اسے الامانت دار روح لے کر نازل ہوئی ہے، تمہارے قلب پر، تاکہ تم ڈراوا سنانے والے ہو جاؤ۔ واضح عربی زبان میں۔"

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (النحل:۱۰۲)

"ان سے کہو، اسے تو روح القدس نے میرے رب کی طرف بتدریج نازل کیا ہے۔"

"امانت دار روح" اور "پاک روح" حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لقب ہے۔ ان دونوں آیتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا بلکہ ان کی نوعیت تخلیق اور دو صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کو مرسل الیہ تک پہنچانے کی خدمت ایسے وجود اور ایسی ہستی سے لی گئی ہے جو مادیت کی کثافتوں سے پاک اور بشری نفسانیت ونقص سے بری ایک روح مجرد ہے، جس میں پاکی و پاکیزگی کے ساتھ امانت کی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن پہنچانے میں اس نے کسی طرح کی خیانت صادر نہیں ہوئی۔ اس میں اس نے ایک شوشے اور ایک حرف کا ردوبدل بھی نہیں کیا اور ٹھیک اسی طرح پہنچا دیا جس طرح اسے اللہ رب العالمین نے عطا کیا تھا۔ قرآنی سفارت ہی کی وجہ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو فرشتوں کے درمیان یہ مقام امتیاز حاصل ہے کہ قرآن میں ان کی متعدد صفات کا مفصل ذکر موجود ہے تاکہ کسی کو بھی اس سفارت کے بارے میں شک وشبہہ پیدا نہ ہو۔ حضرت جبریلؑ کی صفات جاننے کے لیے سورۂ نجم اور سورۂ تکویر بھی پڑھنی چاہیے۔ ہم طوالت کے خوف سے یہاں وہ آیات پیش نہیں کر رہے ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو یہودیوں سے سابقہ پیش آیا۔ یہودی حضرت جبریلؑ کے دشمن تھے اور یہی قرآن کی سفارت پر مامور تھے اس

لیے یہاں آکر لقب کے بجائے ان کا نام لیا گیا تا کہ عداوت یہود کے علی الرغم یہ بات بالکل واضح ہو جائے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(البقرہ:۹۷)

''ان سے کہو، جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے۔''

یعنی جو لوگ جبریل سے عداوت رکھتے ہیں وہ دراصل خدا کے دشمن اور اس کے اختیار و انتخاب پر معترض ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن خدائے بزرگ و برتر کا کلام ہے جسے اس نے اپنی حفاظت میں حضرت جبریلؑ کے ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ مرسل خدائے عزیز و رحیم، سفیر روح الامین اور مرسل الیہ صاحب خلق عظیم اس کے باوجود اگر کوئی شخص قرآن میں شک کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس کا اپنا ذہن مریض ہے اور جب تک وہ اپنے قلب و نظر کا علاج نہ کرے، اسے صحت روحانی حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انسان اس جیسی کتاب بلکہ اس کی سورتوں جیسی کسی سورت کی تصنیف پر بھی قادر نہیں ہے۔ یہ بات انسانی حیطۂ امکان سے باہر ہے کہ وہ اس کلام کی کوئی نظیر پیش کر سکے یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کے مخاطبین اول ـــــ جن کو اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان آوری کا غرہ تھا ـــــ کسی طرح دندھالی سے باز نہ آئے اور بے شرمی کے ساتھ یہ الزام دہراتے رہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود یا کسی کے سکھانے سے یہ کلام گھڑ کر پیش کر رہے ہیں تو اللہ نے پوری قوت کے ساتھ چیلنج دیا کہ اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو اس جیسا کلام پیش کر کے دکھاؤ۔ یہ تحدی ہمیں قرآن کی پانچ سورتوں میں ملتی ہے۔ سورۂ بقرہ ر۳، سورۂ یونس ر۴، سورۂ ہود ر۲، سورۂ بنی اسرائیل ر۱۰، سورۂ طور ر۲۔ ترتیب نزولی کے لحاظ سے یہ تحدی سب سے پہلے سورۂ بنی اسرائیل میں ملتی ہے۔ اس وقت تک قرآن کا ایک معتد بہ حصہ نازل ہو چکا تھا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل:۸۸)

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔"

اس آیت میں صراحۃً جنوں کو تحدی میں دو وجوہ سے شریک کیا گیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ مشرکین عرب جنوں کو معبود بنائے ہوئے تھے اس لیے کہا جا رہا ہے کہ مشرکین ہی نہیں اگر ان کے معبود جن بھی اس مہم میں مددگار بن جائیں تو وہ انہیں اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآن جیسی کوئی کتاب تصنیف کر لیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جنوں کی طرف بھی تھی۔ آپ کی نبوت اور قرآن پر ایمان لانا ان کے لیے بھی ضروری تھا۔ ان میں بھی منکرین نبوت اور منکرین قرآن کی کثیر جماعت موجود تھی اس لیے اس تحدی میں وہ بھی شریک کر لیے گئے تا کہ ان پر بھی حجت پوری ہو جائے۔

اس تحدی میں جس زور بیان اور جس یقین کے ساتھ مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کی ہے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں ہے کیونکہ کسی معقول انسان سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی کسی تصنیف کے بارے میں اس طرح کی تحدی کرے ___ یہی چیلنج دوبارہ ان الفاظ میں نازل ہوا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (ہود: ۱۳، ۱۴)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو (اچھا یہ بات ہے) تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جنہیں تم مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا تم اب سر تسلیم خم کرتے ہو؟"

سورۂ بنی اسرائیل میں تحدی پورے قرآن کے ساتھ تھی۔ اب یہاں کہا جا رہا ہے کہ

پورے قرآن جیسی تصنیف لانے سے عاجز ہو تو اس جیسی دس سورتیں ہی بنا لاؤ اور جب تم سب مل کر اس سے بھی عاجز ہو تو ثابت ہو گیا کہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصنیف نہیں ہے۔ اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس کے علم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے تو ان کا دعویٰ نبوت بھی ثابت ہو گیا، اب بتاؤ، تمہارے پاس کیا عذر باقی رہا، کیا اب تم خدا کا حکم ماننے پر تیار ہو؟ کیا اب تم سر تسلیم خم کرتے ہو؟

یہی تحدی سورۂ یونس میں نیا انداز اختیار کرتی ہے، یہاں پہلے دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کسی انسان کی تصنیف ہو ہی نہیں سکتی۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (یونس:۳۷)

''اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جسے اللہ کے سوا کوئی بنا لے۔''

اس دعوے کے بعد یہ چیلنج دیا گیا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ (یونس:۳۸۔۳۹)

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے۔ کہو، اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورہ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے بلا لو، اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچو) جھٹلا دیا۔''

اب اس مقام پر دس سورتوں کی قید بھی ہٹا دی گئی اور کہا گیا کہ اس جیسی ایک سورہ بھی بنا کر لے آؤ۔ اس طرح اللہ نے تدریج کے ساتھ انسان کے عجز کو اس کی آخری حد پر پہنچا دیا ہے اور اس پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ پورے قرآن کی نظیر تو دور رہی اس جیسی ایک سورہ بھی خدا کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا۔ جن و انس اور خدا کی دوسری مخلوقات کی متحدہ و متفقہ کوشش بھی اس سے عاجز ہے اور رہے گی۔ ساتھ ہی ساتھ ان پر یہ بات بھی کھول دی گئی کہ تمہارے پاس قرآن کو جھٹلانے کی کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے۔ نادانی اور ظن وتخمین تمہاری وہ کل پونجی ہے جس کی بنا پر تم قرآن جیسی کتاب کو جھٹلا رہے ہو ـــــــ سورۂ طور میں یہی بات بہت نرم لہجے میں کہی گئی ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ؕ (طور:۳۳،۳۴)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ رسول نے اسے گھڑ لیا ہے بلکہ (بات یہ ہے) وہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ تو انہیں اس جیسا کلام لے آنا چاہیے اگر وہ اپنے الزام میں سچے ہیں۔"

اس چیلنج کے جواب میں معقول رویہ یہی ہوسکتا ہے کہ یا تو وہ اس جیسا کلام پیش کریں یا پھر یہ تسلیم کرلیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ دعویٰ سچا ہے کہ قرآن میرا کلام نہیں ہے بلکہ خدا کی وحی ہے جو مجھ پر جبریل امین کے واسطے سے اتر رہی ہے۔ مکے میں بار بار چیلنج دینے کے بعد مدینے میں آکر اس تحدی کو ان الفاظ پر ختم کیا گیا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ (البقرہ:۲۳،۲۴)

"اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورہ بنالاؤ اور ایک اللہ کو چھوڑ کر اپنے تمام حمایت کرنے والوں کو مدد کے لیے بلالو اگر تم سچے ہو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کرسکتے تو اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن انسان اور پتھر بنیں گے، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

یہاں بھی تحدی کے ساتھ زوردار پیشین گوئی کی گئی ہے کہ تم ہرگز ایسا کلام پیش نہیں کرسکو گے۔۔۔ نبوت محمدؐ کے منکرین ایک طرف اس بات کے مدعی تھے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ انسان کا کلام ہے۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (مدثر) اور دوسری طرف الزام کو مضبوط کرنے کے لیے یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام ہم بھی پیش کرسکتے ہیں: وَلَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (انفال) اور اگر ہم چاہیں تو ایسی باتیں ہم بھی بناسکتے ہیں۔ لیکن جب ان کو چیلنج دیا گیا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو قرآن جیسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورہ ہی بنا کر لے آؤ تو فصاحت و بلاغت، پرزور و پراثر خطابت، غلغلہ انداز شاعری اور مدعیانہ زبان آوری کے باوجود

ساری شیخی دھری رہ گئی اور کوئی بات بنائے نہ بنی۔

اس چیلنج پر تقریباً چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور یہ آج بھی اسی طرح لاجواب ہے جس طرح اس وقت تھا اور ہمیں یقین ہے کہ یہ قیامت تک اسی طرح لاجواب رہے گا ——— اگر انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی کائنات جیسی کوئی کائنات بناڈالے تو اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی کتاب جیسی کوئی کتاب تصنیف کرلے۔ اگر انسان کا اختیار اور قدرت، خدا کے اختیار و قدرت کا مقابلہ نہیں کرسکتی تو اس کا علم اور اس کی حکمت خدا کے علم و حکمت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ بندہ اگر خدا بننا چاہے تو وہ خدا نہیں ہوسکتا، ہاں اپنی اس متکبرانہ حماقت کی پاداش میں چیونٹیوں کی طرح پامال ضرور ہوسکتا ہے۔ قرآن اللہ کے دفترِ علم و حکمت کا شاہ کار ہے۔ ظلوم و جہول انسان کی کیا مجال کہ وہ اس الٰہی شاہ کار کے مقابلے میں کوئی چیز پیش کرسکے۔[1]

(ماہ نامہ زندگی رام پور، جولائی ۱۹۶۱ء)

---

(۱) اس مضمون کا بقیہ حصہ تلاش بسیار کے باوجود "زندگی" میں نہیں مل سکا۔ شاید شائع ہونے سے رہ گیا (مرتب)

بعثتِ محمدیؐ کا مقصد

کسی جماعت میں نصب العین کو وہی اہمیت حاصل ہوتی ہے جو کسی دائرے میں مرکز ومحور کی ہوتی ہے۔ نصب العین ہی افراد جماعت کو متحد الخیال، یکجا اور صف بند رکھتا ہے اور اس جماعت کا پروگرام اور اس کی تمام سعی و جہد اسی کے گرد گھومتی ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے اپنے لیے جو نصب العین اختیار کیا ہے اس میں اس جماعت کے کسی فرد کی پسند و ناپسند کا دخل نہیں ہے بلکہ اسے اس بات پر یقین حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو اور آخر میں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی نصب العین، اسی مشن اور اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اب قیامت تک کے لیے ان کی نیابت میں امت محمدیؐ کا یہی مقصد وجود ہے۔ اس طرح جماعت اسلامی ہند کے نصب العین کا رشتہ، آپ سے آپ بعثت محمدیؐ کے مقصد سے جڑ جاتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعثت محمدیؐ کا مقصد کیا تھا؟ اس سوال کا جواب، کتاب اللہ میں بھی موجود ہے، احادیث رسولؐ میں بھی پایا جاتا ہے اور اسلامی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ میں اس مقالے میں صرف ایک حدیث پیش کروں گا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ حدیث پیش کی جائے، اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے چند نکات پر غور کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ، انسان کا خالق ہے اور یہ اس کی مخلوق، وہ اس کا معبود ہے اور یہ اس کا عبد، مخلوقیت اور عبدیت انسان کی اصل حقیقت ہے، لیکن سلطان کائنات نے اپنی اس مخلوق کو دنیا میں کیوں بھیجا ہے اور اپنی ناپیدا کنار سلطنت کے ایک بہت ہی چھوٹے ٹکڑے۔ زمین۔ میں اس کی کیا حیثیت مقرر کی ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب، زندگی کا رخ متعین کرنے اور راہ راست پانے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی ابتدا ہی میں انسان کی تخلیق اور اس کی

حیثیت کے بارے میں واضح رہنمائی کی گئی ہے اور وحی الٰہی نے ایک ایسی بات بتادی ہے جسے انسان بطور خود کسی ذریعہ سے نہ جان سکتا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ رب العٰلمین کا خلیفہ ہے۔ عبدیت اس کی حقیقت اور نیابت الٰہی اس کی حیثیت ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے دین وشریعت کی تنفیذ اور دنیا کی اصلاح اس کی ڈیوٹی ہے۔ انفرادی واجتماعی زندگی میں احکام الٰہی کی اطاعت وبندگی اس کا فریضہ ہے۔ یہی وہ جامع، وسیع اور ہمہ گیر فریضۂ حیات ہے جس کے لیے جن وانس کی تخلیق ہوئی ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ٥ (اور میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے)۔ یہ بات مسلّم ہے کہ قرآن میں کسی نوع کا کوئی تضاد یا اختلاف بیانی موجود نہیں ہے اس لیے اس آیت میں عبادت کا کوئی ایسا محدود مفہوم لینا جو انسان کی حیثیت، نیابت الٰہی سے متصادم ہو صحیح نہیں ہے۔ انسان اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے خدا کی پرستش پر مامور ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس چیز میں وہ خدا کا نائب نہیں ہوسکتا، اسے نیابت تو اس چیز میں ملی ہے جو اصلاً خدا کا کام اور تنہا اسی کا حق ہے لیکن اس نے انسان کی آزمائش کے لیے اس کام میں اسے اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا ہے۔ یہ کام کیا ہے؟ دنیا میں اللہ کی تشریعی حکومت قائم کرنا یا دوسرے لفظوں میں اقامت دین، اسلامی حکومت کو خلافت اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ وہ نیابۃً اللہ کے احکام اس کی سلطنت میں نافذ کرتی ہے۔ جن لوگوں نے اس آیت میں عبادت کا مفہوم صرف پرستش میں محدود کردیا ہے انھوں نے سخت دھوکا کھایا ہے۔ یہاں عبادت کا لفظ اللہ کی اطاعت کاملہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس میں پرستش بھی داخل ہے۔ غلامانہ اطاعت، لفظ عبادت کا جوہری اور مرکزی معنی ہے۔ اس کے دوسرے تمام معانی اسی اصل معنی کے گرد گھومتے ہیں، بلکہ فقہی اصطلاح کے "عبادات" میں نصوص شرع کی اطاعت "معاملات" سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ عبادات کی سرحد میں قیاس واجتہاد کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ جب لفظ عبادت کا جوہری معنی اطاعت ہے تو اس آیت میں یہی لفظ کیوں نہ اختیار کیا گیا۔ لِيَعْبُدُوْنِ کے بجائے لِيُطِيْعُوْنِ کہا جاسکتا تھا۔ اس کا اجمالی اور مختصر جواب یہ ہے کہ عبادت صرف اطاعت کو نہیں بلکہ اس غلامانہ اطاعت کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے اور اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مغلوبیت ومقہوریت، سرافگندگی

وافتادگی اور پامالی وپستی کا مفہوم داخل ہے اور اسی مفہوم کی بنا پر مجرد پرستش یعنی کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے اور مراسم عبودیت ادا کرنے کو بھی عبادت کہتے ہیں۔ جب جن وانس کی تخلیق کا مقصد صرف خدا کی غلامانہ اطاعت ہے تو اس کے لیے وہی لفظ استعمال کرنا مناسب تھا جو خدا کے لیے مخصوص ہے۔ غلامانہ اطاعت صرف خدا کا حق ہے اور وہ اپنے بندوں سے اسی طرح کی اطاعت کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ اب اگر اللہ کا کوئی باغی بندہ اپنے جیسے دوسرے انسان سے اپنی ایسی ہی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے یا انہیں اس پر مجبور کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان سے اپنی عبادت کرا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے جواب میں فرمایا تھا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؀ (الشعراء:۲۲)

''اور یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا ہے۔''

اور خود فرعون نے گھمنڈ میں کہا تھا: وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ۔ ''اور موسیٰ وہارون کی قوم ہماری غلام ہے۔'' قرآن میں جہاں کہیں اللہ نے صرف اپنی بندگی واطاعت کا مطالبہ کیا ہے وہاں عبادت کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور جہاں اپنی اطاعت کے ماتحت دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے وہاں عبادت کے بجائے اطاعت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (النساء:۵۹)

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے حاکموں کی۔''

اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے بھٹکے ہوئے انسانوں کو خدا کی فرماں برداری کی طرف بلانے کے لیے عبادت کا لفظ اختیار کیا ہے اور اپنی فرماں برداری کی طرف دعوت دینے کے لیے اطاعت کا لفظ اختیار کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ۙ (نوح:۳)

''اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں عبادت کا لفظ کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ سورۂ حج میں فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔ (الحج:۷۷)

''اے مومنو! رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔''

رکوع اور سجدہ کے بعد عبادت کا حکم صاف بتا رہا ہے کہ پرستش کے بعد زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ آیت زیر بحث وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ میں عبادت کو اصطلاح فقہاء کے "عبادات" میں محصور کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ذہن کے لوگوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے مقصد کو بھی محدود کر دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انبیاء اس لیے بھیجے گئے تھے کہ لوگوں کو بتوں کی پرستش سے ہٹائیں، ملک میں رائج نظام باطل کو بدلنے کا کام یا تو سرے سے ان کے سپرد ہی نہ ہوتا تھا یا اگر ہوتا تھا تو اس کی حیثیت محض ضمنی اور ثانوی تھی۔ ایسے لوگ قرآن سے، ذخیرۂ احادیث سے اسوۂ رسول سے اور سیرت صحابہ سے یا تو اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں یا پھر عجیب و غریب تاویلات سے پورے ذخیرے کو اپنے نظریے کے گرد گھمانے کی سعی کرتے ہیں۔

(۲) یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ہر نبی کی امت کا مقصد زیست، فریضۂ حیات اور نصب العین وہی ہوتا ہے جو خود اس نبی کا رہا ہے۔ نبی کی وفات کے بعد ان پر ایمان لانے والے لوگ اس بات کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ وہ اس مشن کو جاری رکھیں جس کے لیے اللہ نے اپنا رسول مبعوث کیا تھا۔ قرآن کریم نے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد اور ان کے فرائض متعدد مقامات میں الگ الگ بیان کیے ہیں اور متنوع تعبیرات اختیار کی ہیں اور پھر ان سب کو سمیٹنے کے لیے اس نے دو اصطلاح استعمال کی ہے: اقامت دین اور اظہار دین، یعنی دین حق کو قائم کرنا اور اسے تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنا۔ سورۂ شوریٰ میں اقامت دین کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔ وہاں سیدنا محمد رسول اللہؐ کے ساتھ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے نام لے کر اللہ نے بتایا ہے کہ ہم نے ان سب کی طرف جو وحی بھیجی ہے اور انہیں جو وصیت کی ہے وہ یہ ہے کہ "دین کو قائم کرو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔" توبہ، فتح اور صف کی سورتوں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کو اظہار دین کی جامع اصطلاح میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ اقامت دین ہی کی دوسری جامع تعبیر ہے۔ ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دین حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ دین حق کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے۔

(۳) حضورؐ کا مقصد بعثت معلوم ہو جانے کے بعد یہ بات آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے کہ امت مسلمہ کا مقصد وجود اور نصب العین بھی اقامت دین کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ان چند نکات کی طرف مختصر اشارے کے بعد اب وہ حدیث پڑھنی چاہیے جسے پیش کرنا اس مقالے کی اصل غرض ہے:

عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ قَالَ لَقِیْتُ عَبْدَاللّٰہِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قُلْتُ اَخْبِرْنِیْ عَنْ صِفَۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی التَّوْرَاۃِ قَالَ اَجَلْ وَاللّٰہِ اَنَّہٗ لَمَوْصُوْفٌ فِی التَّوْرَاۃِ بِبَعْضِ صِفَتِہٖ فِی الْقُرْاٰنِ ۔یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاھِدًاوَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا قَالَ فِی التَّوْرَاۃِ یَااَیُّھَاالنَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّحِرْزًا لِّلْاُمِّیّٖنَ اَنْتَ عَبْدِیْ وَرَسُوْلِیْ سَمَّیْتُکَ الْمُتَوَکِّلَ لَیْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِیْظٍ وَلَا سَخَّابٍ فِی الْاَسْوَاقِ وَلَا یَدْفَعُ السَّیِّئَۃَ بِالسَّیِّئَۃِ وَلٰکِنْ یَعْفُوْوَیَغْفِرُوَلَنْ یَقْبِضَہٗ حَتّٰی یُقِیْمَ بِہِ الْمِلَّۃَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ یَقُوْلُوْالَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَیَفْتَحُ بِھَا اَعْیُنَ عُمْیٍ وَاٰذَانَ صُمٍّ وَقُلُوْبَ غُلْفٍ۔

”عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی اور ان سے کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صفت بتایئے جو توریت میں ہو۔ انھوں نے کہا' ہاں' بخدا توراۃ میں بھی آپ کی بعض وہ صفات آئی ہیں جو قرآن میں ہیں۔ اے نبی! میں تم کو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور امیوں کا ملجاو ماویٰ بنا کر بھیجا ہے، تم میرے بندے اور رسول ہو۔ میں نے تمہارا نام متوکل، (اللہ پر بھروسہ) رکھنے والا رکھا ہے۔ وہ درشت خو اور سنگ دل نہ ہوں گے اور بازاروں میں شور نہ مچائیں گے اور نہ برائی کو برائی سے دور کریں گے، بلکہ معاف کریں گے اور لوگوں کے قصور بخشیں گے، اللہ اس وقت تک ان کی روح قبض نہ کرے گا جب تک ان کے ذریعہ کج دین کو سیدھا نہ کرے گا اس طرح کہ لوگ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے لگیں۔ پس وہ اس دین مستقیم کے ذریعہ بہت سی اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھولے گا۔“

یہ حدیث امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں دو جگہ روایت کی ہے۔ کتاب البیوع اور کتاب التفسیر میں۔ میں نے اوپر کتاب البیوع کی حدیث کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث انھوں نے الادب المفرد (باب الانبساط الی الناس) میں بھی روایت کی ہے۔ امام احمدؒ اور امام طبرانیؒ نے بھی عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کی ہے۔ امام دارمیؒ نے حضرت کعبؓ اور عبداللہ بن سلامؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے:

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے توریت کے حوالہ سے مختصراً جو باتیں بیان کی ہیں وہ سفر یسعیاہ میں مفصلاً موجود ہیں۔ یہاں اس کی تمام عبارتوں کو نقل کرنا موجب طوالت ہے، میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:

> "دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا میرا "برگزیدہ" جس سے میرا جی راضی ہے میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا، وہ نہ چلائے گا اور نہ اپنی صدا بلند کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا۔ وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں......... میں خداوند تجھے صداقت کے لیے بلایا، میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور میں تجھ کو لوگوں کے لیے عہد اور قوموں کے لیے نور بناؤں گا کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور بند ہووں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانہ سے چھڑائے.......... اے بحری ممالک اور اس کے باشندو! تم زمین پر سرتا سر اس کی ستائش کرو۔ بیابان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔ سلع کے بسنے والے ایک گیت گائیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں گے، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے اور بحری ممالک میں اس کی ثنا خوانی کریں گے۔ خداوند ایک بہادر کی مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی عزت کو اسکائے گا، وہ چلائے گا، ہاں وہ جنگ کے لیے بلائے گا اور اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا اور اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا میں انہیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا.......... وہ شریعت کو بزرگی دے گا اور عزت بخشے گا۔" (باب ۴۲)

حضرت عبداللہؓ نے تورات کے حوالے سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ سب کا سب، کچھ

اضافے کے ساتھ یسعیاہ نبی کی بشارت میں موجود ہے۔ سفر یسعیاہ کے باب ۴۱ میں بھی نبی آخری کی بشارت موجود ہے۔ اس میں ایک جگہ کہا گیا ہے:

''کس نے اس راست باز کو پورب کی طرف برپا کیا اور اپنے پانوں کے پاس بلایا اور امتوں کو اس کے آگے دھر دیا اور اسے بادشاہوں پر مسلط کیا، کس نے انہیں (کافروں کو) خاک کی مانند اس کی تلوار کے، اور اڑتی بھوسی کے مانند اس کی تلوار کے حوالہ کیا۔''

اب اگر کوئی شخص تورات کے ان بیانات کو قرآن کی آیات میں تلاش کرے تو وہ دونوں میں پوری مطابقت پائے گا۔ اگر یہاں تفصیل سے اس مطابقت کو نمایاں کیا جائے تو اس کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے۔

محدث ابن کثیر نے بھی یہ حدیث سورۂ احزاب کی آیت یَاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاھِدًا الخ کے تحت نقل کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے وہب ابن منبہ کی بھی ایک طویل روایت نقل کی ہے۔ میں اس روایت کے کچھ حصوں کا ترجمہ یہاں پیش کرتا ہوں:

میں امیوں میں ایک امی کو مبعوث کروں گا، وہ سخت دل اور درشت خو نہ ہوگا، وہ بیہودہ گوئی سے دور ہوگا، میں اس کے ذریعہ اندھی آنکھوں کو بینا، بہرے کانوں کو شنوا اور بند دلوں کو کشادہ کروں گا، میں اسے تمام اچھے امور کے لیے درست اور تمام اخلاق کریمانہ سے آراستہ کروں گا۔ حق اس کی شریعت، عدل، اس کی سیرت، ہدایت، اس کی رہنما، اسلام اس کا دین، احمد اس کا نام ہوگا۔ ضلالت وگمرہی کے بعد اس کے ذریعہ میں لوگوں کو ہدایت دوں گا، میں اس کی امت کو بہترین امت بناؤں گا۔ وہ لوگ موحد، مومن، مخلص اور ہمارے رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ وہ کھڑے ہوکر اور بیٹھ کر ہماری نماز ادا کریں گے، صف بند ہوکر اللہ کے رستے میں جنگ کریں گے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ وہ رات کے راہب اور دن کے شیر ہوں گے، وہ لوگ اپنے رسول کے بعد حق کی طرف رہنمائی کریں گے اور حق ہی کے ساتھ عدل وانصاف کریں گے جو ان کی مدد کرے گا میں اسے عزت دوں گا، میں انھیں ان کے نبی کا وارث اور داعی الی الحق بناؤں گا، وہ نیکی کا حکم دیں گے، برائی سے روکیں گے، نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور اپنے عہد کو پورا کریں گے، جس خیر کی میں نے ان کے اول گروہ سے ابتدا کی

ہوگی۔ ان کے آخری گروہ کے ذریعہ میں اسے تمام کروں گا، یہ میرا فضل ہے جس کو چاہوں دوں اور میں بڑے فضل والا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں بہ وضاحت معلوم ہوتی ہیں:

(۱) تورات کے حوالہ سے انھوں نے جو صفات بیان کی ہیں وہ قرآن میں بھی موجود ہیں۔ (۲) سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اقامت دین تھا۔ (۳) آپ کی بعثت سے سیکڑوں سال پہلے تورات میں یہ پیشین گوئی موجود تھی کہ جب تک دین قائم نہ ہو جائے آپ کی وفات نہ ہوگی۔ اس طرح یہ حدیث سورۂ شوریٰ اور سورۂ توبہ وغیرہا کی آیتوں کی بہترین شرح بن جاتی ہے۔

یہ تفصیل ہمارے اس یقین میں اضافہ کرتی ہے کہ جماعت اسلامی ہند نے اپنے لیے جو نصب العین اختیار کیا ہے اس میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے بلکہ یہی نصب العین فی الواقع پوری امت مسلمہ کا نصب العین ہے جس سے وہ غفلت برت رہی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ بند دلوں کو کھولے۔ ہمیں خلوص عطا کرے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے ہمیں سرگرم عمل کرے اور ہماری سعی و جہد کو قبول فرمائے۔ آمین! (ماہنامہ زندگی رام پور، اپریل ۱۹۶۲ء)

معراج نبویؐ اور تسخیر کائنات

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں اقبالؒ

معراجِ مصطفےٰ سے یہ سبق صرف انہیں سعید روحوں اور دانش مند دماغوں کو مل سکتا ہے جو اس کائنات میں انسان کی قدر و قیمت اور اس کی حیثیت کا شعور رکھتے ہیں اور اقبال انہیں اولوالالباب (عقل والوں) کی صف کے ایک آدمی تھے۔ معراجِ مصطفےٰ سے یہ سبق لینا کہ کائنات، عالمِ بشریت کی زد میں ہے انہیں لوگوں کے لیے ممکن ہے جو قرآن، احادیث اور تابناک اسلامی تاریخ سے واقف ہوں۔ اللہ و رسول نے جن حقیقتوں کی تعلیم دی ہے اور اللہ کے رسولوں اور اس کے صالح بندوں کے ساتھ جو واقعات گزر چکے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے انسان کا چاند پر قدم رکھ دینا، عقل کو حیرت زدہ کر دینے والا کوئی واقعہ نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں انسان اب تک جو کچھ کر چکا ہے اس پر ''کھودا پہاڑ نکلی چوہیا'' کی مثل صادق آتی ہے۔

انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے

قرآن نے بتایا ہے کہ انسان زمین کے اس چھوٹے سے کرے پر اللہ کا خلیفہ اور نائب بنا کر اتارا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو جو علم و فہم عطا کیا ہے، جو عقل دی ہے اور جو صلاحیتیں بخشی ہیں وہ بحیثیت مجموعی تمام دوسری مخلوقات سے زیادہ ہیں۔ اس میں جو قوتیں ودیعت کی گئی ہیں وہ اسے متضاد اور مختلف النوع صفات سے متصف بنا سکتی ہیں۔ اس کے قلب و دماغ اور اس کے عالمِ خیال

کو وہ وسعت عطا کی گئی ہے کہ پوری کائنات اس میں سمٹ آتی ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ چھوٹا سا وجود ایک ایسا عالم اکبر ہے جس کے مقابلے میں دوسری تمام دنیائیں عالم اصغر کہے جانے کی مستحق ہیں، اس میں اس کے خالق نے جو روح پھونکی ہے وہ اگر پاک وصاف اور اپنے خالق و مالک کی مطیع و وفادار ہو تو اس کی قوت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان کی ماہیت میں وہ استعداد ودیعت کی گئی ہے جو اس کے قلب کو اللہ رب العزت کی دائمی تجلیات کی فرودگاہ و جلوہ گاہ بنا سکتی ہے جس کے سامنے کسی چاند اور سورج کی کوئی حقیقت نہیں۔ اب یہ انسان کی اپنی پسند اور اس کا اپنا ظرف ہے کہ وہ اپنے لیے کیا چاہتا اور کس چیز کے حصول کے لیے اپنی جان کھپاتا ہے۔

کائنات انسان کے لیے مسخر ہے

قرآن نے دوسری حقیقت صراحت کے ساتھ یہ بتائی ہے کہ اللہ نے انسانوں کے لیے اپنی وسیع کائنات کی بہت سی چیزیں مسخر کر دی ہیں۔ اس نے ہمارے لیے نہروں کو، دریاؤں کو اور سمندر کو مسخر کر دیا ہے۔ اس نے ہمارے لیے ہواؤں کو اور بادلوں کو مسخر کر دیا ہے۔ اس نے ہمارے لیے رات اور دن کو، سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے، اس نے ہمارے لیے وحشی جانوروں کو اور زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے یہاں تک کہ بعض آیتوں میں اس کی صراحت ہے کہ اس نے آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ سب ہمارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

سورۂ لقمان آیت ۲۰ میں فرمایا گیا ہے:

> ''کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔''

''کھلی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو آدمی کو کسی نہ کسی طرح محسوس ہوتی ہیں یا جو اس کے علم میں ہیں۔ اور چھپی ہوئی نعمتوں سے وہ نعمتیں مراد ہیں جنہیں آدمی نہ جانتا ہے نہ محسوس کرتا ہے۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں انسان تحقیق کے جتنے قدم آگے بڑھاتا جا رہا ہے اس کے سامنے خدا کی بہت سی وہ نعمتیں بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں جو پہلے اس سے بالکل مخفی تھیں۔''

سورۂ الجاثیہ آیت ۱۳ میں کہا گیا ہے:

"اس نے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اپنی طرف سے (اپنے فضل و کرم سے)۔"

ان آیتوں میں تسخیر کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا کر انہیں ہماری خدمت میں لگا دیا ہے۔ یہ سب کے سب اس کے بنائے ہوئے قوانین میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان قوانین کا سر رشتہ صرف خدا کے دست قدرت و حکمت میں ہے۔ انسان اپنی عقل، اپنے تجربے اور اپنے سائنس سے جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ بعض ان طبیعی قوانین سے واقف ہو جائے جن کے ماتحت اللہ نے اپنی کائنات کی چیزوں کو جکڑ رکھا ہے۔ آج کل تسخیر کائنات کی اصطلاح بالکل غلط معنے میں رائج ہے۔ سمجھا یہ جا رہا ہے کہ سائنس داں رفتہ رفتہ کائنات کی بہت سی چیزوں کو مسخر یعنی اپنا تابع فرمان بناتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اللہ نے کائنات کی جن چیزوں کو انسانوں کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ سائنس داں ان میں سے بعض کے طبیعی قوانین کا علم حاصل کر رہے ہیں اور انہیں یقین ہو یا نہ ہو ہمیں یقین ہے کہ انہیں یہ علم بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہی حاصل ہو رہا ہے۔ قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اللہ نے ان تمام چیزوں کو انسانوں کے لیے اس لیے مسخر کیا ہے کہ وہ اس کا فضل تلاش کریں، اس کے شکر گزار بندے بن کر رہیں اور اس کی کبریائی و آقائی کے گن گائیں۔

کائنات انسان کی خادم ہے

اس دوسری حقیقت سے یہ تیسری حقیقت آپ سے آپ منکشف ہوتی ہے کہ کائنات کی جن چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے وہ اس کی خادم ہیں اور انسان ان کا مخدوم ہے۔ ان میں تقدس اور معبودیت کا کوئی شمہ بھی موجود نہیں ہے لیکن انسان پر جب زوال آیا اور اس نے اپنے نفس کی بندگی اختیار کی تو وہ سورج، چاند، ستارے اور معلوم نہیں اپنے کن کن خادموں کا خود پجاری بن گیا۔ معبودان باطل میں سورج اور چاند کو ہمیشہ بڑا درجہ حاصل رہا ہے اور دنیا کی شاید ہی کوئی مشرک قوم ہو جس نے ان دونوں کی پرستش نہ کی اور ان کو اپنا معبود نہ بنایا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں خاص طور پر اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کریں بلکہ اس کو پوجیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ آیت ۳۷ میں فرمایا گیا ہے:

"اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا۔اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔"

استحقاق بقدر ظرف

قرآن وحدیث کی تعلیم دی ہوئی چوتھی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے علم وفہم، اپنی عقل ودانش اور حصول علم کی استعداد کو جن چیز کے لیے وقف کرے گا اس کا نتیجہ اور پھل اسے ملے گا۔ اگر طالبان دنیا اسی کو اپنا مقصد زندگی اور مطمح نظر بنالیں اور یہی ان کی سعی وجہد کا محور بن جائے تو دنیا انہیں ملے گی لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۝ (الشوریٰ:۲۰) "اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔" جو لوگ اپنے علم کو صرف دنیا کے گرد گردش دیں گے ان کے علم کی رسائی صرف اسی دنیا تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔اسی کو قرآن نے ذالک مبلغھم من العلم کہا ہے۔سورۂ النجم آیت ۲۹، ۳۰ میں فرمایا گیا ہے:

"آپ اس شخص سے اعراض کیجیے جو ہمارے ذکر سے منہ موڑے اور دنیوی زندگی کے سوا اور کچھ نہ چاہیے بس یہیں تک ہے اس کے علم وفہم کی رسائی۔"

یہ آیت آج کی بے دین حکومتوں، ملحد دانشوروں اور دنیا پرست سائنسدانوں پر پوری طرح صادق آتی ہے اور ذالک مبلغھم من العلم (بس اسی دنیا تک ہے ان کے فہم کی رسائی) کے بلیغ جملے میں ان کے ذہن اور ان کی تمام علمی، تحقیقی اور خلائی جدوجہد کی تصویر کھنچ آئی ہے۔ جو لوگ آخرت کے حساب اور وہاں کی جزا وسزا کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ وہ صرف دنیا کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اس کو اچھا سمجھیں اور اسی میں مگن رہیں بلکہ آخرت پر ایمان رکھنے والوں اور وہاں کے حساب کتاب سے ڈرنے والوں کو بے وقوف سمجھیں اور ان پر ملا کی پھبتی کسیں۔ایک جگہ قرآن نے ان کے ذہن کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

"ان سے کہیے کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ونامراد لوگ کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی ساری سعی وجہد دنیا کی زندگی ہی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ اچھا کام کر رہے ہیں۔" (الکہف:۱۰۳، ۱۰۴)

دین و مذہب سے ان کی بیزاری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ خود ان کی تحقیق کے نتیجے میں جو چیز نہ صرف اللہ کے وجود بلکہ اس کی قدرت اور حکمت کی واضح دلیل بن رہی ہوتی ہے۔ یہ اس کو بھی انکار خدا کی دلیل بنا لیتے ہیں۔

معراج نبویؐ

ہم مسلمان تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام اپنے مادی جسم کے ساتھ ایک عرصہ تک آسمانی جنت میں مقیم رہے اور پھر وہاں سے زمین پر اتارے گئے۔ اس کے علاوہ اہل السنۃ والجماعۃ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے مادی جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھا لیے گئے ہیں اور تقریباً دو ہزار سال سے ان کا مستقر آسمان ہی ہے۔ اور ایک دن آنے والا ہے جب وہ اپنے اسی مادی جسم کے ساتھ پھر اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ اور تیسری طرف ہم واقعۂ معراج کو بھی تسلیم کرتے ہیں جو خلائی سفر کے لحاظ سے ایک بے مثال واقعہ ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے قیامت تک بے مثال ہی رہے گا۔ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ کی ایک عظیم نشانی بھی ہے اور اس کے خلیفہ و نائب۔ انسان۔ کی قدر و قیمت، عزت و رفعت اور اس کی قوت وصلاحیت کا محیر العقول مظاہرہ بھی۔

صحیح احادیث میں واقعۂ معراج کی جو تفصیلات مذکور ہیں ان سب کو نقل کرنا یہاں موجب طوالت بھی ہے اور غیر ضروری بھی، نفس واقعہ یہ تھا کہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں ایک رات، حضرت جبریل امین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے، براق پر لے کر روانہ ہوئے اور بیت المقدس پہنچے، وہاں حضورؐ نے براق کو ایک پتھر سے باندھ دیا اور مسجد اقصیٰ میں انبیاء کرام علیہم السلام کی نماز میں امامت کی اور پھر اسی شب کو آسمانوں کے سفر پر روانہ ہوئے، پہلے آسمان پر پہنچے، پھر دوسرے پر، پھر تیسرے پر یہاں تک سات آسمان طے کرکے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور پھر وہاں سے حضورؐ تنہا اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے۔ اسی شب کو پانچ وقت کی نمازیں فرض کی گئیں اور آپ کو جنت اور جہنم کا مشاہدہ کرایا گیا اور پھر اسی شب کو بیت المقدس واپس آئے اور براق پر سوار ہو کر صبح سے پہلے مکہ معظمہ واپس پہنچ گئے۔ اگر اس رات کو پورے بارہ گھنٹوں کا بھی مانا جائے تو سفر معراج کی مدت زیادہ سے زیادہ ۹، ۱۰ گھنٹے قرار پاتی ہے۔ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سفر کی صراحت سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ہے اور وہاں سے خلائی سفر اور واپسی کی

تفصیلات صحیح احادیث میں ہیں البتہ سورۃ النجم میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس حضرت جبریل کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کا ذکر ہے اور اس سلسلے کی کچھ دوسری باتیں بھی مذکور ہیں اور یہ ثابت ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ تک آپ کا سفر معراج قرآن سے ثابت ہے۔

جس جانور کی پیٹھ پر آپ نے بیت المقدس تک سفر کیا اس کا نام براق اس کی برق رفتاری اور چمک دمک کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اس جانور کا رنگ سفید اور اس کی شکل و ہیئت گھوڑے سے مشابہ تھی۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ آپؐ کے سامنے ایک گھوڑا لایا گیا اور آپ اس پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔

ہم یہ نہیں جانتے کہ مسجد اقصیٰ تک سفر کے لیے اللہ نے مخصوص طور پر اس جانور کی تخلیق کی تھی یا اس طرح کا جانور آسمانوں میں کہیں موجود ہے جو اس خدمت کے لیے زمین پر اتارا گیا تھا۔ احادیث وسیر کی روایات میں آتا ہے کہ صبح کو جب آپؐ نے اپنے اس سفر کا حال بیان کیا تو پورے مکہ شہر میں ہل چل مچ گئی۔ مشرکین نے تو اس کا شدید انکار کیا ہی بعض کمزور ایمان کے مسلمان بھی فتنے میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ مکہ سے بیت المقدس تک ایک مہینے کی مسافت کو کوئی شخص چند گھنٹوں میں طے کر کے اسی شب کو کس طرح واپس آ سکتا ہے۔ کمزور ایمان کے مسلمانوں کو اس پر تعجب ہوا ہوگا کہ ایک شخص اپنے مادی جسم کے ساتھ اتنی سرعت رفتار سے کس طرح سفر کر سکتا ہے اور وہ کون سا جانور ہوگا جو اتنی تیزی سے لے گیا اور واپس لایا۔ اس انکار و تعجب سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے جسمانی سفر ہی کی خبر دی تھی ورنہ بات صرف روحانی سفر کی ہوتی تو مشرکین بھی اس کا اتنا شدید انکار نہ کرتے اور نہ آپ کی ہنسی اڑاتے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے انکار و تعجب کی تو کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آتی۔

مشرکین نے صرف ہنسی اڑانے پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے خیال باطل میں آپ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے ایک ایسا امتحان لیا کہ اس کی وجہ سے ایک دوسرا معجزہ رونما ہوا، انھوں نے حضورؐ سے مسجد اقصیٰ کی ہیئت، اس کے ستونوں کی تعداد اور اس طرح کی دوسری تفصیلات پوچھنی شروع کیں۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ جس سفر پر تشریف لے گئے تھے اس میں ان تفصیلات کو جاننے کا کیا موقع تھا؟ اس امتحان کے وقت دوسرا معجزہ یہ رونما ہوا کہ روحانی طور پر مسجد اقصیٰ پوری کی پوری آپ کے سامنے کر دی گئی اور آپ ان کے ہر سوال کا جواب اسے دیکھ دیکھ کر دیتے رہے اور

مشرکین کو اس کی تصدیق کرنی پڑی۔ ہم اس زمانے میں تقریب فہم کے لیے اس معجزے کو ''روحانی ٹیلی ویژن'' کہہ سکتے ہیں۔ مکہ سے بیت المقدس تک کے جس تیز رفتار سفر کا مشرکین نے اتنی شدت سے انکار کیا تھا اب سائنس کی ترقی نے ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مادے میں بھی اتنی قوت رکھی ہے کہ چند گھنٹوں میں مکہ سے بیت المقدس پہنچ کر وہاں سے واپس آیا جا سکتا ہے۔

موجودہ سائنسی ترقیوں کے بارے میں مسلمانوں کا موقف

سائنس کے نقطۂ نظر سے واقعۂ معراج نے سرعت رفتار کے ایک ایسے پیمانے کا انکشاف کیا ہے جو ابھی سائنس دانوں کے تصور و خیال سے بھی پرے ہے۔ ان لوگوں نے واقعۂ معراج کے تیرہ سو برس بعد یہ دریافت کیا ہے کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ ابھی تک اس سے زیادہ تیز رفتار کوئی چیز دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ روشنی ہی کی رفتار کے حساب سے انھوں نے ''نوری سال'' کی اصطلاح بنائی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بعض سیاروں کی روشنی ایک نوری سال میں زمین تک پہنچتی ہے اور بعض کی اس سے بھی زیادہ مدت میں، یہاں تک کہ ان کا خیال ہے کہ بعض سیاروں کی روشنی اب تک زمین پر نہیں پہنچ سکی ہے۔ اس بیان سے اس مادی کائنات کی وسعت اور اس کے طول مسافت کا تصور بھی ایک مشکل کام ہے۔ اور اب یہ دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسد شریف کے ساتھ اس مادی کائنات کو طے کر کے سات آسمانوں سے گزرے اور پھر سدرۃ المنتہیٰ پہنچے اور وہاں سے اس مقام تک بلند ہوئے جہاں جبریل امین کی رسائی بھی نہیں ہے اور جس کے بارے میں شاعر نے ان کی زبان سے کہا ہے۔

اگر یک سر موئے برتر پرم   فروغ تجلی بسوزد پرم

زمین سے اس مقام بلند کی مسافت کا اندازہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس مقام تک حضورؐ کا جسم اطہر بلند ہوا اور چند گھنٹوں میں زمین پر واپس آیا۔ یہ ایک ایسی سرعت رفتار ہے جس کے مقابلے میں روشنی کی رفتار بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ قرآن اور احادیث کی صراحتوں کے تحت ہم مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے فرشتے روزانہ صبح و شام اس مادی کائنات کو طے کر کے زمین پر آتے اور واپس جاتے ہیں لہٰذا ان کی رفتار بھی روشنی کی رفتار سے بہت زیادہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان سے کمتر درجے کی مخلوق جنات کی سرعت رفتار بھی روشنی کی رفتار سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ سائنس دانوں کو فرشتوں اور جنوں پر یقین ہو یا نہ ہو

ہمیں ان پر اس سے زیادہ یقین ہے جتنا ان کو روشنی کی رفتار پر ہے۔ انسان جو اللہ کا نائب اور اشرف المخلوقات ہے اس دنیا میں ایک دوسرے ہی مقصد سے بھیجا گیا ہے ورنہ اس کے خاکی جسم میں وہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ سرعت رفتار میں فرشتے اور جن بھی پیچھے رہ جائیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا درجہ تو بہت بلند ہے۔ صالحین کے جسم میں بھی یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے کہ جنوں کی رفتار بھی اس سے مات کھا جائے۔ اس کی ایک قطعی الثبوت مثال ہمیں خود قرآن میں ملتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کا تخت فوری طور پر اپنے دربار میں منگوانے کا ارادہ فرمایا اور اہل دربار سے کہا۔

> "سلیمان نے کہا اے اہل دربار تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں۔ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا۔ میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں، میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔ جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں جوں ہی کہ سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا وہ پکار اٹھے یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری، اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔" (النمل آیت ۳۸ تا ۴۰)

جس شخص نے پلک جھپکنے سے پہلے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے سے وہ تخت حاضر کر دیا تھا۔ عام طور سے مفسرین ان کا نام آصف بن برخیا لکھتے ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحابی اور وزیر تھے۔ دیکھیے کہ ایک خاکی انسان کی سرعت رفتار کے مقابلے میں ایک قوی ہیکل جن بھی مات کھا گیا۔

سائنس دانوں نے اب تک جتنے راکٹ چھوڑے ہیں اور خلائی جہازوں نے جو زیادہ سے زیادہ رفتار حاصل کی ہے وہ ابھی روشنی کی رفتار کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ بالفرض وہ ایسا راکٹ بھی ایجاد کر لیں جو روشنی کی رفتار سے پرواز کر سکے جب بھی کسی مسلمان کو اس پر حیرت نہ ہوگی۔

واقعۂ معراج کو ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خلائی سفر کیا تھا اس کے لیے آپ کو کوئی غیر معمولی لباس نہیں پہنایا گیا تھا اور نہ دوسرا کوئی دفاعی و حفاظتی انتظام کیا گیا تھا بلکہ آپ مجرد اپنے جسد اطہر کے ساتھ روزانہ کے معمولی لباس میں تشریف لے گئے تھے اور

جس سرعت رفتار کے ساتھ یہ سفر ہوا تھا اس سے جو حرارت پیدا ہوئی ہوگی وہ سخت سے سخت فولاد کو بھی پگھلا دینے کے لیے کافی ہوگی۔ لیکن حضورؐ کے پاک جسم کو ذرہ برابر کوئی گزند نہیں پہنچا۔ قادر مطلق کی عظیم قدرت کا یہ ایک ایسا نشان ہے جو انسانی عقل کو حیرت زدہ بلکہ دہشت زدہ کر دیتا ہے۔ یقیناً اس وقت آپ کے جسم مبارک پر ایک ایسا غیر مرئی ملکوتی لباس ہوگا جس نے آپ کے جسم میں وہ خصوصیت پیدا کر دی جو جبریل امین کے جسم میں تھی۔

حضورؐ کے ساتھ دوسرا جو عظیم الشان واقعہ پیش آیا وہ معجزۂ شق القمر کا واقعہ ہے۔ ایک شب کو مکہ معظمہ میں آپؐ کی انگشت شہادت نے ایک اشارے میں چاند کے دو ٹکڑے کر دیے۔ دیکھنے والوں نے اس کو اچھی طرح دیکھا اور پھر وہ دونوں ٹکڑے جڑ گئے اور چاند جس طرح پہلے اپنی نورانی کرنیں بکھیر رہا تھا، پھر بکھیرنے لگا۔ جن لوگوں کو اس واقعہ پر یقین ہو وہ کسی انسان کے چاند پر پہنچ جانے سے حیرت زدہ کیوں ہوں گے؟

تمام سیارے اپنے خالق کے حکم کے مطیع ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے۔ چاند اللہ کی ایک مخلوق ہے جس میں کوئی تقدس نہیں ہے۔ ہر ماہ مسلمان ہلال نو دیکھ کر جو دعا پڑھتا ہے اس میں یہ بھی کہتا ہے: ربنا و ربک اللہ (اے چاند ہمارا اور تیرا دونوں ہی کا رب اللہ ہے)۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا، جو مسلمان ان حقیقتوں سے آگاہ ہیں ان کے لیے کسی انسان کا چاند پر قدم رکھ دینا کوئی حیرت انگیز واقعہ بھی نہیں ہے چہ جائیکہ اس سے کوئی تشویش پیدا ہو۔ بلاشبہ یہ سائنس دانوں کے کمال فن کا مظاہرہ ہے لیکن اس سے دین اسلام کی کسی تعلیم پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ تشویش تو ان لوگوں کو ہونا چاہیے جو چاند کو قابل پرستش سمجھتے ہیں اور جو انسان کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس دنیا میں اللہ نے انسانوں کو جو عقل دی ہے علم کی جو صلاحیت بخشی ہے اس کے استعمال اور اس کے نتائج سے بہرہ ور ہونے سے کسی کو محروم نہیں کیا ہے عام ازیں کہ وہ اللہ کا فرماں بردار ہو یا نافرمان۔

افسوس یہ ہے کہ آج بہت سے مسلمان بھی قرآن و حدیث کی بیان کردہ حقیقتوں سے ناواقف ہیں۔ وہ اس کائنات میں انسان کی حیثیت اور اس کی صلاحیتوں کا علم بھی نہیں رکھتے اور ماضی میں انسانوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان سے بھی ناآشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

ان ناواقف مسلمانوں میں سے کچھ لوگ انسان کے خلائی سفر اور چاند پر اس کے نزول کی خبر سے متوحش ہو گئے ہیں۔ اگر وہ کم سے کم ان حقیقتوں سے بھی واقف ہوتے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو پریشان نہ ہوتے۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ سائنس کتنی ہی ترقی کر جائے وہ قرآن کی بیان کی ہوئی کسی حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔

چاند پر انسان کے قدم رکھنے اور وہاں سے مٹی اور پتھر آنے سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ چاند پر کسی زندہ مخلوق کے وجود کا جو خیال تھا یا یہ جو سمجھا جا رہا تھا کہ انسان زمین سے جا کر وہاں آباد ہو سکتا ہے وہ اب تک کی تحقیق کے مطابق غلط ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح مریخ میں بھی اب تک زندگی کا کوئی نشان نہیں ملا ہے۔ جو مسلمان اس خبر سے اس لیے متوحش تھے کہ قرآن میں زمین ہی کو انسان کا مستقر اور مستودع کہا گیا ہے اس لیے اگر انسان چاند پر آباد ہو گیا اور وہیں مر کر دفن ہوا تو یہ بات قرآن کے خلاف ہو گی اور اسی طرح کے بہت سے فقہی سوالات ان کے سامنے آگئے ہیں انہیں مطمئن ہونا چاہیے کہ چاند یا مریخ پر جا کر انسانوں کے آباد ہو جانے کا احتمال وقیاس بھی اب ختم ہو رہا ہے۔

(ماہ نامہ زندگی رام پور، ستمبر ۱۹۶۹ء)

اسلامی تحریک مکی دور میں

مکہ اور اس کے آس پاس کا ماحول

مکے میں اسلامی تحریک نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے مکہ اور اس کے اردگرد کے ماحول کو سمجھنا ضروری ہے۔ ماحول کو سمجھنے سے مراد یہ ہے کہ عہد جاہلیت کے عقائد و اعمال کا مطالعہ کیا جائے اور اس دور کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی حالات پر گہری نظر ڈالی جائے۔ یہ مطالعہ ہمیں بتائے گا کہ اس زمانے میں نہ صرف مکہ نہ صرف جزیرۃ العرب اور اس کے ہم سرحد ملکوں میں بلکہ دنیا بھر میں کفر و شرک کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ انسانیت کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی تھی اور وہ ظلم و استبداد کے شکنجے میں کسی ہوئی کراہ رہی تھی۔ طاقت ور لوگ کمزوروں پر مسلط تھے اور کوئی امید نہ رہی تھی کہ انسان مساوات کا بجھا ہوا چراغ پھر روشن ہو سکے گا۔ انسانی اخوت و مرحمت و مواسات کی فضا پھر کبھی پیدا ہو سکے گی اور حق و انصاف کا نظام پھر کبھی برپا ہو سکے گا۔ امانت و دیانت اس طرح رخصت ہو چکی تھی کہ اس وقت کسی شخص کا ''امین'' ہونا معجزے سے کم نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کے ہاتھ سے توحید کا سررشتہ چھوٹ گیا تھا اور شترِ بے مہار کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ آخرت کو وہ بھول چکا تھا اور یہی دنیا اس کی زندگی کا مقصود بن گئی تھی۔ جس اعلیٰ مقصد کے لیے وہ دنیا میں بھیجا گیا تھا وہ اس کے ذہن و دماغ سے اس طرح گم ہو گیا تھا کہ اس کا کوئی دھندلا تصور بھی باقی نہ رہا تھا۔ دنیا پرستی اس کے رگ ریشے میں پیوست ہو گئی تھی۔ انسان ایک طرف اپنے ہی ہم جنس دوسرے انسانوں کی غلامی میں گرفتار تھا اور دوسری طرف بت پرستی اور اوہام پرستی کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ

خدا کا منکر نہ تھا۔لیکن اس نے خدا کی ذات وصفات اور اس کے مخصوص حقوق میں بے شمار چیزوں کو شریک قرار دے رکھا تھا۔اس نے اپنی زندگی کو دو بڑے خانوں میں بانٹ دیا تھا۔ایک خانہ دنیوی اور مادی زندگی کا تھا اور دوسرا روحانی اور مذہبی زندگی کا۔اس کے مادی خانے پر قوم کے سردار اور طاقت ور افراد مسلط تھے اور مذہبی خانے کو اس نے بزعم خویش بتوں، جنوں، فرشتوں اور گزرے ہوئے انسانوں کی روحوں کے حوالے کر دیا تھا۔

سیاسی ماحول

مکہ کا سیاسی ماحول یہ تھا کہ وہاں قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں کی چھوٹی سی شہری مملکت قائم تھی اور انھوں نے اہم امور میں مشورے اور فیصلے کے لیے اپنی ایک چھوٹی سی پارلیمنٹ "دارالندوہ" کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔جزیرۃ العرب میں حجاز کا علاقہ کسی بیرونی طاقت کا محکوم نہ تھا لیکن اس کے جو علاقے ایران وشام سے قریب تھے وہ ایرانی اور رومی حکومتوں کے محکوم ہو گئے تھے اور وہی علاقے سرسبز وشاداب اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے ترقی یافتہ تھے۔انہیں علاقوں میں عربوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم رہی تھیں۔لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ان علاقوں کے امراء ورؤساء پرشین ورومن امپائر کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے۔

معاشی ماحول

مکہ ایک بنجر علاقہ تھا جسے خود قرآن نے وادی غیر ذی زرع (بے آب وگیاہ وادی) کہا ہے۔(ابراہیم:۳۷) قریش کا ذریعہ معاش یا تو تجارت تھا یا وہ نذرانے جو حج کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر تمام عرب قبیلوں سے انہیں ملتے تھے۔عام طور پر فقر وافلاس کا عالم یہ تھا کہ بعض افراد قتل اولاد تک کا جرم کر گزرتے تھے۔

مذہبی ماحول

مکہ کا مذہبی ماحول یہ تھا کہ شرک چھایا ہوا تھا اور ان کی بت پرستی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ انھوں نے کعبہ میں جو توحید کا مرکز تھا ۳۶۰ بت جما رکھے تھے۔ان کے گھروں میں جو بت تھے وہ الگ تھے۔جزیرۃ العرب میں شرک کی تمام قسمیں موجود تھیں۔یمن کا قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش

کرتا تھا۔ قبیلہ کنانہ چاند کا پجاری تھا۔ بنو تمیم دیران (ایک ستارے کا نام) کو اپنا معبود سمجھتے تھے۔ قیس، اسد، لخم اور جذام کے قبیلے بالترتیب، شعریٰ (ایک ستارے کا نام جس کا ذکر سورۂ النجم میں ہے)، عطارد اور مشتری کو پوجتے تھے۔ عرب کے لوگ انوا (نچھتر) کو بارش وغیرہ کے لیے مؤثر حقیقی سمجھتے تھے۔ قریش کا سب سے بڑا بت ہبل تھا جس کو انھوں نے کعبہ کی چھت پر نصب کیا تھا اور لڑائیوں میں اسی کی جے پکارتے تھے۔ اس کے بعد لات اور عزیٰ کا درجہ تھا۔ ان کی اوہام پرستی نے کاہنوں، منجموں، تعویذ گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے کا کاروبار کرنے والوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اوہام پر وہ بطور خود بھی عمل کرتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ اگر کوئی شخص سفر کے لیے گھر سے نکلے اور پھر پلٹ کر پیچھے دیکھ لے تو اس کا سفر تمام نہ ہوگا۔

۲۔ اگر کوئی شخص خرگوش کا ٹخنہ گلے میں لٹکا لے تو اس پر سحر کا اثر نہ ہوگا اور نہ اس کو کسی کی نظر لگے گی۔

۳۔ اگر کسی ایسے گاؤں کے پاس پہنچ گیا جس میں کوئی وبا ہے تو اس کے دروازے کے پاس کھڑا ہو کر گدھے کی طرح آواز نکالے تب اس میں داخل ہو، ایسا کرنے سے وبا کا اثر اس پر نہیں ہوگا

۴۔ اگر کوئی شخص راستہ بھول جائے تو اپنے کپڑے الٹ پلٹ کر لے، راستہ مل جائے گا۔

۵۔ جب کوئی عرب سفر کرتا تھا تو کسی درخت کی شاخ میں گرہ لگا دیتا تھا۔ جب سفر سے واپس آتا تو وہاں جا کر اس شاخ کو دیکھتا اگر گرہ کھلی ہوئی پائی جاتی تو کہتا کہ میری بیوی نے خیانت کی ہے اور اگر گرہ اپنی جگہ ہوتی تو کہتا کہ میری بیوی محفوظ رہی۔

۶۔ گائیں جب پانی پینا چھوڑ دیتی تھیں تو وہ بیلوں کو پیٹتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جن بیلوں پر سوار ہو جاتے ہیں اور وہی گایوں کو پانی پینے سے روکتے ہیں۔

۷۔ ان کا خیال تھا کہ جب کسی کو قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کے سر سے ایک الو نکلتا ہے اور اس کی قبر پر اس وقت تک اسقونی، اسقونی (مجھے سیراب کرو۔ مجھے سیراب کرو) چیختا رہتا ہے جب تک مقتول کا انتقام نہ لے لیا جائے۔

یہ ان کی اوہام پرستی میں سے چند چیزیں ذکر کی گئی ہیں ورنہ ان کی زندگی کے بکثرت

اعمال وافعال میں اس طرح کی اوہام پرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً انھوں نے سات تیر بنائے تھے اور ہر تیر پر کوئی بات لکھ دی تھی اور ضرورت کے وقت انہیں پانسوں کی طرح پھینک کر احکام حاصل کرتے تھے، جیسے کسی تیر پر نعم (ہاں) لکھا ہوتا تھا اور کسی پر لا (نہیں)۔ سفر کرنا ہے تو پانسے پھینکے اگر "نعم" والا تیر نکلا تو سفر کیا اور "لا" والا تیر نکل آیا تو سفر ملتوی کر دیا۔

معاشرتی وتمدنی ماحول

نسل ونسب پر بے حد غرور کی وجہ سے انسانی مساوات کا تصور ہی ختم ہو گیا تھا۔ ننگ وعار کے احمقانہ تصور نے ان میں سے بہت سے لوگوں کو اتنا بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے تا کہ کسی کو داماد بنانے کا ننگ گوارا نہ کرنا پڑے۔ عورتوں کی ذلت و رسوائی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیویاں سوتیلے بیٹوں کے درمیان جائداد منقولہ کی طرح تقسیم ہو جاتی تھیں اور ان میں سے بعض اپنی سوتیلی ماں سے نکاح بھی کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے نکاح کی ایسی قسمیں بھی رائج کر رکھی تھیں جن کو بدکاری کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے معاشرے میں یہ بات بھی جائز سمجھی جاتی تھی کہ جس طرح جانوروں سے اچھی نسل حاصل کرنے کے لیے کسی اچھی نسل کے نر سے جفتی کرائی جاتی ہے اسی طرح کوئی دیوث اپنی بیوی کو اعلیٰ نسل کے کسی شخص کے پاس بچہ حاصل کرنے کے لیے بھیجتا تھا اور اس وقت تک خود اس سے مباشرت نہیں کرتا تھا جب تک اس سے حمل قرار نہ پا جائے۔

نکاح کی کوئی حد مقرر تھی، نہ طلاق کی۔ ایک شخص دس عورتوں سے نکاح کر سکتا تھا اور جب کسی بیوی سے ناراض ہو جاتا تو اسے طلاق دے کر رجوع کر لیتا اور مسلسل یہی کرتا رہتا، وہ اس عورت سے نہ خود تعلق قائم کرتا اور نہ اسے آزاد کرتا کہ وہ کسی اور سے نکاح کر سکے۔ غلامی کا رواج عام تھا اور غلاموں سے برتاؤ جانوروں سے بھی بدتر تھا۔

اخلاقی ماحول

شراب خواری، قمار بازی اور زنا کاری عام تھی، بے حیائی کا حال یہ تھا کہ عورتیں بھی ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ عورتوں اور یتیم بچوں پر ظلم کرتے اور طاقت ور لوگ کمزور حق داروں کو محروم کر کے ان کی میراث خود ہڑپ کر لیتے۔ لوٹ مار، قتل اور رہزنی کی وجہ سے جزیرۃ العرب

درندوں کا مسکن بن گیا۔ جنگ کے موقع پر قیدیوں کو زندہ جلا دیتے۔ عورتوں کے پیٹ پھاڑ ڈالتے۔ یہاں تک کہ معصوم بچوں کو قتل کر دیتے۔ بیرونی تاجروں سے بد معاملگی کرتے اور ان کا مال ہڑپ کر لیتے۔ ابوجہل بھی جو قریش کا بہت بڑا سردار تھا اس جرم کے ارتکاب سے نہ شرماتا۔ ابولہب جو قریش کا ایک دوسرا بڑا سردار تھا کعبہ کے محفوظ مال میں چوری کرتا۔ غرض یہ کہ معاشرے کو بگاڑنے والی ہر طرح کی بداخلاقی رائج تھی۔

عرب کی خوبیاں

ان حد سے بڑھی ہوئی برائیوں کے ساتھ ساتھ قبیلہ قریش میں بالخصوص اور حجاز کے دوسرے قبائل میں بالعموم چند ایسی خوبیاں بھی تھیں جنھیں نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان کا ایک بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ غلامانہ ذہنیت اور اس سے بنے ہوئے ذلیل کردار سے نا آشنا تھے۔ انھوں نے ہمیشہ آزاد فضا میں سانس لی تھی اور کسی بیرونی طاقت کی غلامی ومحکومی برداشت نہیں کی تھی۔ وہ مغلوبیت اور محکومیت سے نفرت کرتے اور آزادی کے دل دادہ تھے۔ ان کے حاکم خود انہیں کے اپنے سرداران قبائل تھے یا وہ اپنے آپ حاکم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی حمیت وغیرت، شجاعت و سخاوت، جرأت اقدام اور خطرات کے مقابلے میں ثبات اور علو ہمت کی اچھی صفات پوری طرح ان کے اندر موجود تھیں وہ مہمان نواز بھی تھے اور ان کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے۔ اگر ان کے مہمان پر کوئی ٹیڑھی نگاہ ڈالتا تو وہ اس کی حفاظت کرتے اور اپنی جان پر کھیل جاتے تھے۔ ذہین اور صاحب فہم تھے۔ خدا کے قائل تھے اور اسی کو مدبر کائنات مانتے تھے۔ کڑے وقت اور مشکل اوقات میں اس سے دعا بھی مانگتے تھے۔ کعبے کا طواف کرتے اور موسم حج میں حج بھی ادا کرتے۔ وہ برائیوں میں لت پت تھے۔ لیکن نیکی اور بدی کے فرق سے ناواقف نہ تھے۔ ظالم اور خوں خوار تھے لیکن ظلم کو عدل اور بہیمیت کو انسانیت قرار نہیں دیتے تھے۔ ان میں گنے چنے ایسے افراد بھی موجود تھے، جو شرک وکفر ومعصیت اور درندگی وبداخلاقی سے نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ حالات بدلیں اور عرب کے لوگ اصل ملت ابراہیمی کی طرف پلٹیں۔ شاید اسی تلاش حق کی بنا پر عرب کے متعدد قبیلوں نے نصرانیت یا یہودیت اختیار کر لی تھی۔ خود مکہ میں قریش کے بعض افراد نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور توریت وانجیل کے علم میں بہت اونچا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل، اپنے آخری نبی ورسول کی بعثت

اور اپنی آخری کتاب کے نزول کے لیے اسی قوم کو منتخب فرمایا۔ یہ ماحول تھا کہ کوہ فاران کی چوٹی سے وحی الٰہی کا نور چمکا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب ہدایت بن کر وادی بطحا میں اترے۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

مکے میں تحریک اسلامی کی سب سے پہلی مہم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن اخلاق حسنہ سے آراستگی اور جس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے پیدا کیا اور انسان سے اس کے جو مطالبات ہیں ان کی بجا آوری کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ انسان کے دل ودماغ کو کفر وشرک ومعصیت کی آلودگی سے پاک کیا جائے۔ اسے انسانوں کی غلامی، اپنے نفس کی بندگی اور اوہام کے پھندوں سے آزاد کیا جائے اور اس کے دل ودماغ میں یہ حقیقت پیوست کی جائے کہ دنیا کی زندگی ایک آزمائشی اور عارضی زندگی ہے۔ جس طرح اسے اس کا یقین ہے کہ موت برحق ہے اسی طرح اسے یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ موت کے بعد کی زندگی بھی برحق ہے۔ وہی زندگی ابدی ہے اور آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔

قرآن کا مطالعہ اور مکے کی اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے یہی مہم چلائی۔ انھوں نے انسان پر انسان کی خدائی ختم کرنے اور اسے سب طرف سے کاٹ کر خدا کے ساتھ جوڑ دینے کی جدوجہد شروع کی۔ توحید کا صاف ستھرا اور مکمل تصور پیش کیا۔ خدا کی کامل بندگی اور اپنی مکمل اطاعت کا مطالبہ ان کے سامنے رکھا اور آخرت کے آرام وآلام کو نوع بہ نوع انداز میں اس طرح پیش کیا، جیسے قیامت اور آخرت آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

اس نظریاتی اور اساسی مہم کے ساتھ ساتھ دوسری مہم جو آپ نے چلائی وہ برے اخلاق سے پاکی، اچھے اخلاق سے آراستگی، مرحمت ومواسات، کمزوروں اور مظلوموں کی دست گیری و چارہ سازی کی مہم تھی۔

مخالفت کا آغاز

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں لکھا ہے کہ مشرکین مکہ نے مخالفت کا آغاز اس وقت کیا جب آپؐ نے ان کے معبودانِ باطل پر تنقید شروع کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ معبودانِ باطل

پر تنقید حق کے فروغ اور اس کی اشاعت میں کوئی مضر یا غیر ضروری طرز عمل ہوتا تو قرآن کا سکھایا ہوا طریقۂ تبلیغ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس سے خالی ہوتا۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ کی تنقید گالی ہرگز نہ تھی اور نہ اس کا انداز اور لب ولہجہ ناموزوں تھا لیکن اس کے باوجود مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ انسانی عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جب تک باطل عقیدتوں اور نظریات وخیالات کے بت پاش پاش نہ ہوں انسان کا کعبۂ دل پاک وصاف نہیں ہوسکتا اور نہ حق اس میں جاگزیں ہوسکتا ہے۔

آپ حکمت، موعظہ حسنہ اور جدال احسن کے ساتھ حق کی تبلیغ کرتے رہے اور مخالفت بڑھتی رہی۔ جیسے جیسے حق کا نور پھیل رہا اور باطل کی تاریکی سمٹ رہی تھی مفاد پرست سرداران قریش آتش زیر پا ہوتے جا رہے تھے۔ اسلام ایک دین فطرت ہے اور قرآن اللہ کا کلام، اس لیے وہ تمام لوگ جن کے دل تعصب، گھمنڈ اور مفاد پرستی سے زنگ آلود نہیں ہوئے تھے قرآن کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔ آپ جس توحید اور جس بندگی رب کی دعوت دے رہے تھے اس کا اجمالی بیان یہ ہے:

> "انہیں بتایا گیا کہ اللہ ایک ہے اور اس کی الوہیت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے اور نہ صفات میں، وہ ایک ہے اور اس کی اکائی ناقابل تقسیم ہے۔ وہ یکتا ہے اور اس کی یکتائی کا کوئی سہیم نہیں۔ وہ رب ہے اور اس کی ربوبیت میں کوئی اس کا ساجھی نہیں۔ وہ کائنات کا صرف خالق ومدبر ہی نہیں ہے بلکہ ساری کائنات کا حاکم بھی ہے۔ جس طرح سورج اور چاند پر اس کی حکومت ہے اسی طرح انسانوں کا حکمراں بھی وہی ہے۔ آسمان کا خدا بھی وہی ہے اور زمین کا خدا بھی وہی۔ جس طرح اس کی ذات ناقابل تقسیم ہے اسی طرح اس کی حاکمیت بھی غیر منقسم ہے۔ اس کو اپنا الٰہ اور رب ماننے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی اس کے حوالے کر دے اور وہ مکمل طور پر اس کا بندہ بن جائے۔ انسان کو اس کا حق نہیں کہ اپنی زندگی کا قانون آپ بنائے، اس کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں اللہ کے قانون کی پیروی کرے۔ اسی کی رضا کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد اور اپنی تمام سعی وجہد کا حاصل قرار دے۔ اسی کے سامنے جھکے، اسی کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ اسی سے دعا کرے اور مصائب کے وقت اسی کو مدد کے لیے پکارے۔ تمام اختیار واقتدار کا مالک تنہا وہی ہے، جس کے پاس جو کچھ ہے اسی کا عطیہ ہے۔ انسان اپنی تمام قوتوں سمیت اسی کی ملک ہے اس لیے وہ اپنے نفس کا بھی مالک نہیں کہ مالک حقیقی کی اجازت کے

بغیر اس میں کوئی تصرف کر سکے۔ ایک دن آئے گا جب اسے اپنی پوری زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ اگر اس نے فرماں برداری اور اطاعت کی ہوگی تو خدا کی رضا کا مستحق ہوگا اور اگر بغاوت و نافرمانی کی ہوگی تو اس کے غضب میں گرفتار ہوگا۔ انسانوں کی ہدایت کا قانون خدا نے ہمیشہ اپنے رسولوں کے ذریعہ بھیجا ہے اس لیے اس کے رسولوں کی پیروی واتباع ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے دنیا و دین دونوں ہی کی فلاح حاصل ہو سکتی ہے۔"

عقیدہ توحید کے اس اجمالی بیان کی تفصیلات تمام مکی سورتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان تمام سورتوں میں سے اگر ہم صرف تین سورتوں: الانعام، ہود اور الشوریٰ کا مطالعہ کریں تو ان میں بھی عقیدۂ توحید کی تفصیلات مل جائیں گی۔ سورۂ الانعام کا تفصیلی مطالعہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ مکہ میں تحریک اسلامی کے آخری دور کی سورت ہے اور بیک وقت پوری سورت نازل ہوئی ہے۔ اس میں ان بہت سے توہمات اور ظالمانہ و مشرکانہ اعمال و افعال کا بھی ذکر ہے جن میں مشرکین عرب مبتلا تھے۔

اللہ کی حاکمیت مطلقہ اور اقتدارِ اعلیٰ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں جس توحید کی دعوت دے رہے تھے وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ پر ایمان واقرار کی دعوت تھی۔ اس ایمان واقرار کے بغیر عقیدۂ توحید کا وجود ہی ممکن نہیں ہے۔ کفار و مشرکین کے سامنے یہی حقیقت پیش کی جارہی تھی کہ اللہ کی حاکمیت کوئی مقید اور محدود حاکمیت نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو بلکہ اس کی حاکمیت مطلق اور غیر محدود ہے۔ مشرکین عرب، پوری کائنات پر اللہ کی فطری و تکوینی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے قائل تھے۔ یہاں تک کہ انسانی زندگی کے غیر اختیاری حصے پر بھی وہ خدا ہی کو حاکم مانتے تھے۔ مثلاً زندگی و موت کے بارے میں ان کا خیال بھی یہی تھا کہ یہ صرف خدا کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہی کسی کو زندگی عطا کرتا ہے اور وہی زندگی سے محروم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بہت سے مقامات پر یہ حقیقت ان پر واضح کی گئی ہے کہ جب تم اللہ کو کائنات کا خالق اور اس کا مدبر مانتے ہو، اسی کو روزی رساں اور اپنی موت و حیات کا مالک مانتے ہو تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ تمہاری عبادت و اطاعت کا مستحق بھی صرف وہی ہے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے

کا حق بھی صرف اسی کو ہے اور زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتانا بھی صرف اسی کا کام ہے۔ اللہ کے سوا دوسری ہستیاں کہاں سے اور کس بنیاد پر تمہاری پرستش اور اطاعت کی مستحق بن گئی ہیں؟

قرآن میں ہر جگہ اللہ کی تکوینی حاکمیت کو اس کی تشریعی حاکمیت کی اساس و برہان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے کسی آیت میں اس کی تکوینی حاکمیت کا ذکر ہے اور کسی آیت میں اس کی تشریعی حاکمیت کا۔ اس کا یہ مطلب نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ جہاں اس کی تکوینی حاکمیت کا ذکر ہے، وہاں اس کی تشریعی حاکمیت مراد نہیں ہے اور جہاں اس کی تشریعی حاکمیت کا ذکر ہے وہاں اس کی تکوینی حاکمیت مراد نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دونوں حاکمیتیں ایک دوسرے کو مستلزم ہیں۔ نہ اس کی تکوینی حاکمیت، تشریعی حاکمیت سے الگ کی جا سکتی ہے، اور نہ اس کی تشریعی حاکمیت، تکوینی حاکمیت سے جدا ہو سکتی ہے اس لیے جن آیتوں میں اس کی تکوینی حاکمیت کا ذکر ہے وہ اس کی تشریعی حاکمیت کی بھی دلیل ہیں اور جن آیتوں میں اس کی تشریعی حاکمیت کا ذکر ہے وہ اس کی تکوینی حاکمیت کی بھی دلیل ہیں۔(۱)

کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ کی تکوینی و تشریعی حاکمیت کے اس لزوم کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے اللہ کی تشریعی حاکمیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے شریعت اور قانون دینے کا حق صرف اسی کو ہے۔ جس طرح آسمان اور زمین، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، زندگی اور موت پر اس کی حکومت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اسی طرح ہدایت و رہنمائی اور انسانی زندگی کے لیے قانون سازی بھی صرف اسی کا حق ہے اور اس حق میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ زندگی کا ہر وہ قانون جو اس کے نازل کیے ہوئے قانون کے خلاف ہو، باطل ہے۔

سورۃ الانعام کی ابتداہی بیان توحید سے ہوئی ہے۔ ابتدائی تین آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی آسمانوں اور زمین، ظلمات اور نور کا خالق ہے اور اسی نے انسان کی تخلیق کی ہے۔ آسمانوں اور زمین میں وہی ایک خدا ہے جو تمہارے چھپے اور کھلے اور تمام اعمال سے واقف ہے اور اس کے فوراً ہی بعد آیت ۴ اور ۵ میں آیات الٰہی کے انکار پر ملامت کی گئی ہے اور قرآن کے

(۱) عرصۂ دراز سے غیر اسلامی نظامِ زندگی کے تحت رہتے رہتے بہت سے ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن سے بھی اللہ تعالیٰ کی تکوینی و تشریعی حاکمیت کا لزوم نکل گیا ہے۔ آج ان میں ایسے دین دار مفسر قرآن بھی موجود ہیں، جو ان آیتوں سے جن میں اللہ کی تکوینی حاکمیت کا ذکر ہے اس کی تشریعی حاکمیت کو خارج سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک وہ آیتیں تشریعی حاکمیت کی دلیل نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

انکار پر وعید سنائی گئی ہے۔ معمولی عقل بھی یہ سمجھ سکتی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب اللہ انسانوں سمیت پوری کائنات کا خالق ہے تو پھر ان سب کے مقصد تخلیق کی تعیین وتوضیح کرنے والا دوسرا کون ہوگا؟ یہ کتنی غیر معقول اور احمقانہ بات ہے کہ یہ کفار و مشرکین اللہ کو سب کا خالق مانتے ہیں لیکن اسی خالق نے جب ان کے مقصد تخلیق اور طریقہ زندگی کی توضیح کے لیے اپنا رسول بھیجا اور اپنی کتاب نازل کی تو یہ اس کا انکار کر رہے ہیں۔ انھوں نے بغیر کسی دلیل اور سند کے دوسروں کو اللہ کا ہم سر بنا رکھا ہے۔ وہ ان کی پرستش بھی کر رہے ہیں اور ان سے اپنی زندگی کے قاعدے اور ضابطے بھی حاصل کر رہے ہیں۔

مکہ معظمہ میں جس توحید اور جس بندگی رب کی دعوت دی جارہی تھی اس کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں بھی غیر اللہ کی اطاعت کرنے والوں کو صراحتاً مشرک کہا گیا ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۧ (الانعام:۱۲۱)

”اور جس چیز پر خدا کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ کہ اس کا کھانا گناہ ہو اور شیاطین اپنے رفیقوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم ان کے کہے پر چلے تو بے شک تم بھی مشرک ہوئے۔“

مثال کے طور پر ان کا ایک مجادلہ یہ تھا کہ ”اے مسلمانو! تم خدا کے مارے ہوئے جانور کو حرام کہتے ہو اور جسے خود مارتے ہو اس کو حلال قرار دیتے ہو“۔ ان کے اس احمقانہ مجادلے کے جواب میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ یہ شیاطین ہیں جو اپنے دوستوں اور رفیقوں کے دلوں میں اس طرح کے اعتراضات وشبہات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے مجادلہ کریں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ کے احکام پر عمل کرو۔ اگر اس بات میں تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے کیونکہ اس طرح کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے میں تم ان لوگوں کو خدا کا شریک قرار دے لو گے۔ اس آیت کے تحت مفسرین نے ائمہ تفسیر وفقہ کے یہ اقوال نقل کیے ہیں:

قال الزجاج فيه دليل علىٰ اَنَّ مَنْ اَحَلَّ شَيْئًا مِمَّا حَرَّمَ اللّٰهُ

اَوْ حَرَّمَ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فَهُوَ مُشْرِكٌ۔دلت الاٰية على من استحل شيئا مما حرم الله تعالىٰ صار به مشركاً۔ (قرطبی)

"زجاج نے کہا: یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال قرار دے یا اس کی حلال کی ہوئی کسی چیز کو حرام قرار دے تو وہ مشرک ہے۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جس شخص نے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال قرار دیا وہ اس کی وجہ سے مشرک ہو جائے گا۔"

انمايكون المومن بطاعة المشرك مشركااذا اطاعه فى الاعتقادوان اطاعه فى الفعل واعتقاده سليم مستمرعلى التوحيد والتصديق فهوعاص۔ (ابن عربی)

"مشرک کی اطاعت سے کوئی مومن اس وقت مشرک ہو جائے گا جب وہ اعتقاداً اس کی اطاعت کرے اور اگر وہ صرف عملاً اس کی اطاعت کرے اور اس کا عقیدہ محفوظ ہو توحید و تصدیق اپنی جگہ برقرار ہو تو وہ گنہگار ہو گا۔"

ابن عربی کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شرک دو قسم کا ہوتا ہے: اعتقادی اور عملی۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے بارے میں عقیدتاً یہ سمجھتا ہو کہ وہ مستقل بالذات شارع ہے اور اسے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا حق ہے تو وہ حقیقی مشرک ہے اور اگر وہ اعتقاداً تو صرف اللہ ہی کو مستقل بالذات شارع مانتا ہے لیکن عملاً کسی ایسی چیز کا استعمال کر رہا ہو جسے مشرکین حلال سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہوگا بلکہ عملاً شرک میں مبتلا اور سخت گنہگار ہوگا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سورۂ انعام کی یہ آیت اللہ تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت کی ایک دلیل قطعی ہے اور صراحتاً بتاتی ہے کہ جس طرح کسی دوسرے کو لائق پرستش معبود سمجھنا شرک ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے کے بارے میں یہ سمجھنا بھی شرک ہے کہ وہ شریعت الٰہی کے علی الرغم انسانی زندگی کے لیے شریعت اور قانون بنانے کا حق رکھتا ہے۔[1]

سورۂ یونس آیت ۵۹ میں کہا گیا ہے:

(۱) میں نے سورۂ انعام کی آیت وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ پر زندگی جلد ۴۰ شمارہ ۲۵ فروری ۶۸ء میں کچھ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔

"اے نبیؐ! ان سے کہو۔ تم لوگوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اتارا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھیرا لیا۔ ان سے پوچھو اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟"

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے کسی چیز کو بطور خود اللہ کی اجازت کے بغیر حلال یا حرام قرار دینا اس کے مخصوص حق میں اپنے آپ کو شریک قرار دینے کے مترادف ہے۔ "رزق" کا لفظ لغت عرب اور قرآن و احادیث کے استعمالات میں صرف کھانے پینے کی چیزوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت و صلاحیت پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کی دی ہوئی توفیق کے لیے بھی "رزق" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مشہور دعا ہے: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ (اے اللہ! ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کے اتباع کی توفیق دے)۔ مفردات امام راغب میں ہے: رُزِقْتُ عِلْمًا (مجھے ایک علم عطا کیا گیا)۔ سورۂ یونس کی اس آیت میں جو الفاظ آئے ہیں وہ سورۂ انعام کی آیت سے زیادہ عام ہیں اور سورۂ یونس کی آیت سے بھی زیادہ عام الفاظ سورۂ النحل کی آیت ۱۱۶ میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

"اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی چیز کے بارے میں بھی اس کے حلال یا حرام ہونے کا حکم لگانا، اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے کیونکہ کسی چیز کے بارے میں حلال یا حرام ہونے کا حکم صرف وہی لگا سکتا ہے اس کے سوا کسی دوسرے کا یہ حق نہیں ہے۔

سورۂ شوریٰ کی ابتدا بھی اللہ تعالیٰ کی فطری و تکوینی حاکمیت کے بیان سے کی گئی ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر اللہ نے اپنی تشریعی حاکمیت کی توضیح کی ہے۔ آیات ایک سے بارہ تک اس کی تکوینی حاکمیت کی تفصیل ہے اور تیرہویں آیت سے تشریعی حاکمیت کی توضیح شروع کر دی گئی ہے اور پھر اسی سلسلہ کلام میں مشرکین کے خودساختہ دین و شریعت کا انکار کیا گیا ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ

وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَإِنَّ الظّٰلِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ (الشوریٰ:۲۱)

"کیا یہ لوگ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔ اگر فیصلے کی بات پہلے سے طے نہ کر لی گئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔ یقیناً ان ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

"اس آیت میں شرکاء سے مراد ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پوجا پارٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں بلکہ لامحالہ ان سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین، طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں اور اپنی سیاست اور حکومت میں اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروری ان کو کرنی چاہیے۔ یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ رب العالمین کی تشریع کے خلاف، اور اس کے اذن (SANCTION) کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔" (تفہیم القرآن ج ۴ ص ۴۹۹)

بہت قدیم زمانے سے، مشرکین نے انسانی زندگی کو روحانی و مادی یا مذہبی و دنیوی کے دو بڑے خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مذہبی خانے کو انھوں نے بتوں، جنوں اور روحوں کے حوالے کر دیا ہے اور مادی و دنیوی خانے کو اپنے نفس اور اپنے لیڈروں کے سپرد کر دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی قوم نے جو جواب دیا تھا وہ اس کی واضح دلیل ہے۔

"انھوں نے جواب دیا۔ اے شعیب، کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو

اپنے مال میں اپنے منشاء کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے۔" (ہود: ۸۷)

"یہ اسلام کے مقابلے میں جاہلیت کے نظریہ کی پوری ترجمانی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا جو طریقہ بھی ہے، غلط ہے اس کی پیروی نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ کسی دوسرے طریقے کے لیے عقل، علم اور کتب آسمانی میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی بندگی صرف ایک محدود مذہبی دائرے ہی میں نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں میں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ دنیا میں انسان کے پاس جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے اور انسان کسی چیز پر بھی اللہ کی مرضی سے آزاد ہو کر خود مختارانہ تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلے میں جاہلیت کا نظریہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو طریقہ بھی چلا آ رہا ہو انسان کو اسی کی پیروی کرنی چاہیے اور اس کی پیروی کے لیے اس دلیل کے سوا کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ نیز یہ کہ دین و مذہب کا تعلق صرف پوجا پارٹ سے ہے۔ رہے ہمارے زندگی کے عام دنیوی معاملات، تو ان میں ہم کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ جس طرح چاہیں کام کریں۔

اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کو مذہبی و دنیوی دائروں میں الگ الگ تقسیم کرنے کا تخیل آج کوئی نیا تخیل نہیں ہے بلکہ آج سے تین ساڑھے تین ہزار برس پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو بھی اس تقسیم پر ویسا ہی اصرار تھا جیسا آج اہل مغرب اور ان کے مشرقی شاگردوں کو ہے۔ یہ فی الحقیقت، کوئی نئی "روشنی" نہیں ہے جو انسان کو آج "ذہنی ارتقا" کی بدولت نصیب ہو گئی ہو بلکہ یہ وہی پرانی تاریک خیالی ہے جو ہزار ہا برس پہلے کی جاہلیت میں بھی اسی شان سے پائی جاتی تھی اور اس کے خلاف اسلام کی کش مکش بھی آج کی نہیں ہے، بہت قدیم ہے۔" (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۳۶۱)

یہ تھی توحید و بندگی رب کی وہ دعوت جو مکے میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ اسے پڑھ کر اور جان کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اس توحید پر مبنی اسلامی نظام زندگی کسی غیر اسلامی نظام زندگی کے تحت پنپ سکتا اور فروغ پا سکتا ہے۔

زہرہ گداز استقامت کا حکم

مکے میں اس توحید اور بندگی رب کی دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی مختصر تفصیل اوپر گزری۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کو جس استقامت، ثابت قدمی اور جماؤ کا حکم دیا گیا ہے اس کو پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں لیکن یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ زہرہ گداز استقامت کا حکم دے کر ارحم الراحمین خدا نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس استقامت کے بغیر اللہ کا بھیجا ہوا دین حق، ادیان باطلہ پر غالب آ ہی نہیں سکتا۔ اپنے موقف سے ہٹ کر اور ظالموں کی طرف جھک کر اپنے لیے دنیوی آرام و راحت کی راہ تو ہموار کی جا سکتی ہے لیکن دین حق کو دین باطل پر غالب نہیں کیا جا سکتا۔ سورۂ ہود آیت ۱۲ میں فرمایا گیا ہے:

> ”تو اے پیغمبر! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جارہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کہ وہ کہیں گے ”اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا“ یا یہ کہ ”اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔“ تم محض خبردار کرنے والے ہو آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے۔“

یہ آیت مکہ کے ان انتہائی سنگین اور بے حد پریشان کن حالات کا تصور دیتی ہے جن میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بے آمیز توحید اور کامل بندگی رب کی دعوت دے رہے تھے۔ اس میں توجہ دلائی گئی ہے کہ آپؐ جن مشکل حالات میں کام کر رہے تھے۔ ان میں بڑے سے بڑے شیر دل انسان کا زہرہ آب ہو سکتا اور اس کے قدموں میں لغزش آ سکتی ہے۔ ان حالات کا دباؤ یہ خیال پیدا کر سکتا ہے کہ وحی الٰہی کے بعض اجزا کا اعلان و اظہار نہ کیا جائے اور اس کا یہ فائدہ ذہن میں آ سکتا ہے کہ اس طرح شدید مخالفین کی مخالفت میں کچھ نرمی پیدا کی جا سکتی اور ان کو اپنے سے کچھ قریب لایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو یاد دلایا ہے کہ تمہارے ذمے ڈرا وا سنا دینے اور پیغام پہنچا دینے کی خدمت کی گئی ہے۔ منکرین حق کے دلوں میں ہدایت کا نور ڈالنے اور ان کو اپنی بات منوا دینے کا کام تمہارے ذمے نہیں کیا گیا ہے۔ جب پوزیشن یہ ہے تو تمہارا کام یہ ہے کہ جو کچھ وحی تم پر کی جارہی ہے وہ بے کم و کاست لوگوں تک پہنچاتے رہو۔ یہ نہ سوچو کہ کون اس کو مانتا ہے اور کون نہیں مانتا، کون تمہارے قریب آتا ہے اور کون نہیں آتا۔ تمہارا کام یہ ہے کہ ان انتہائی سنگین حالات میں بھی اپنے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہو ــــــ اسی سورۂ ہود میں یہ بھی حکم دیا گیا ہے:

"پس اے محمدؐ! تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچائے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔" (ہود: ۱۱۲، ۱۱۳)

یہ دو آیتیں کسی تشریح کی محتاج نہیں ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ داعیانِ حق کے لیے حق پر جمنے کی آزمائش کتنی کڑی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں جو مکہ کے آخری دور کی سورہ ہے، تین باتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی طرح اپنے موقف پر جمے رہے اور آپؐ کے قدموں میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ دوسری یہ کہ ایسا اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی توفیق سے ہو سکا۔ اللہ کی مدد کے بغیر کسی شخص کے قدم سیلابِ مخالفت میں ٹک نہیں سکتے۔ اور تیسری بات یہ کہ اگر خدانخواستہ آپؐ ظالموں کی طرف ذرا بھی مائل ہوتے تو اس کا انجام کیا ہوتا۔ فرمایا گیا ہے:

"اے محمدؐ! ان لوگوں نے کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزا چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا۔ پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔" (بنی اسرائیل: ۷۳-۷۵)

ان آیتوں سے بھی معلوم ہوا کہ ظالموں کی طرف میلان اور حق سے انحراف کی سزا کتنی شدید ہے۔ اس طرح کی آیتیں مکی سورتوں میں ہی ملتی ہیں اور یہ بالکل قرینِ عقل ہے کیوں کہ ظالموں کی طرف میلان اور حق سے انحراف کا اندیشہ مکے ہی کے سنگین حالات میں ہو سکتا تھا۔

(ماہنامہ زندگی رام پور، ستمبر ۱۹۷۲ء)

مکی دعوت کا عنوان جہاد بالقرآن

ایک بار اس حقیر نے سوچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس ساتھیوں نے مکہ معظمہ میں جو دعوتی زندگی بسر فرمائی، اگر اس کو ایک مختصر عنوان میں ظاہر کرنا ہو تو وہ کیا ہو سکتا ہے؟ تھوڑے سے غور وفکر کے بعد ذہن، سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ کی طرف منتقل ہو گیا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ٥ (الفرقان:۵۲)

''پس اے نبیؐ کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔''

اس آیت کریمہ نے مکہ کی تیرہ سالہ دعوتی جدوجہد کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ یہی جہاد بالقرآن مکہ میں دعوت اسلامی کا عنوان بن سکتا ہے۔ اس جہاد کبیر میں کیا کچھ لٹانا پڑا اور کیا کچھ برداشت کرنا پڑا۔ اس وقت یہ تاریخ میرے موضوع سے خارج ہے۔

غار حرا کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں جب وحی الٰہی کا پہلا نور چمکا اور روح الامین اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کی روح لے کر اترے تو وہ ایک ایسا انقلاب انگیز واقعہ تھا جس نے تاریخ انسانی کے ہر شور اور پرزور دھارے کا رخ موڑ دیا۔ ایک ایسا تاریخ ساز لمحہ جو اپنی برکت اور سعادت میں بے نظیر تھا۔ تاریخ نبوت و رسالت کا وہ آخری دور شروع ہوا جو قیامت تک جاری رہنے والا ہے۔

رمضان کا مبارک مہینہ، مبارک رات۔ قدر کی رات، اور اللہ کا صالح ترین بندہ مصروف عبادت۔ یکایک جبریل امین۔ جن کا وجود افق کو گھیر لیتا ہے۔ چھوٹے سے غار میں اتر آئے۔ ''پڑھو۔'' جواب ملا ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' فرشتے نے سینے سے لگا کر بھینچا، اس قدر کہ بھینچنے والے کی قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر چھوڑ دیا۔ ''پڑھو۔'' ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' وہی عمل پھر دہرایا گیا۔ پڑھو۔ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ سہ بار وہی عمل دہرایا گیا۔ اس کے بعد جبریلؑ نے کہا:

"پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔" (العلق: ۱تا۵)

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — وہ ایک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور پھر تیرہ برسوں تک جہاد بالقرآن کا سلسلہ روز و شب جاری رہا۔ مکہ کی گلیوں میں، حرم کعبہ میں جہاں تین سو ساٹھ بت سجا دیے گئے تھے۔ پہاڑ کی بلندی پر، وادی کے نشیب میں، حج کو آنے والے سرداران قبائل کے خیموں میں، بازاروں میں اور منڈیوں میں، شعب ابی طالب کی قید میں اور طائف کی سنگ باری میں، ہر وقت اور ہر جگہ اللہ کا آخری رسول روشنی بکھیرتا ہوا، تاریکیوں سے لڑتا رہا۔ وحی الٰہی پکارتی رہی، ڈھارس دیتی رہی۔ ہر موڑ پر رہنمائی کرتی رہی۔

جہاد بالقرآن کے عناصر و اجزاء

(۱) نفی و تردید۔ شرک و کفر کی، مشرکانہ و کافرانہ خیالات، اقوال و افعال کی۔

(۲) اثبات و توثیق۔ اللہ کی وحدانیت، اس کی معبودیت، مالکیت، حاکمیت، اس کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے تمام اسمائے حسنیٰ کی اور عقیدۂ توحید کے تقاضوں کی۔

(۳) اثباتِ نبوت و رسالت اور اس پر ایمان کے تقاضوں کا۔

(۴) اثباتِ آخرت اور اس پر ایمان کے تقاضوں کا۔

(۵) اچھے اخلاق و کردار کی تلقین و ترغیب

(۶) برے اخلاق و کردار کی ممانعت و ترہیب

(۷) انفرادی و اجتماعی اصلاح کے احکام اور مسلم معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے رہنما اصول۔

(۸) اس بات کا اعلان کہ دین حق قائم ہو کر رہے گا اور مخالفین کا جتھا شکست خوردہ، پیٹھ پھیر کر بھاگے گا۔

مکہ معظمہ میں قرآن لے کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جہاد کیا اس کے یہ عناصر و اجزاء سرسری طور پر سامنے آ گئے ہیں۔ یہ اس جہاد کبیر کے تمام عناصر و اجزاء کا استقصاء نہیں ہے۔ ان آٹھ نکات پر بھی تفصیل سے لکھا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو جائے گی۔ ہم اختصار و اجمال کے ساتھ صرف نکتہ (۱) و (۸) پر چند باتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

شرک کی نفی وتردید کے لیے قرآن کریم میں متعدد اسلوب اختیار کیے گئے ہیں۔نفی و اثبات کا اسلوب۔خالص اثباتی اسلوب۔استفہام انکار کا اسلوب۔نہی وممانعت کا اسلوب۔ عبادت کو اللہ کے لیے مخصوص کرنے کا اسلوب۔سجدے کو اللہ کے لیے خالص قرار دینے کا اسلوب۔ طلب استغفار وتوبہ کا اسلوب ـــــ ان تمام اسالیب سے شرک کی نفی وتردید اور توحید کا اثبات کیا گیا ہے۔یہ بات معلوم ہے کہ شرک کی ہر نفی توحید کا اثبات ہے اور توحید کا ہر اثبات شرک کی نفی ہے۔ان تمام اسالیب کی تمام آیتوں کو جمع کرنا ایک لمبا کام ہے۔اس لیے بطور مثال ایک ایک آیت پیش کی جارہی ہے۔

(الف) نفی واثبات کا اسلوب

(۱) وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (القصص:۷۰)

”وہی ایک اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔اسی کے لیے حمد ہے۔دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی فرماں روائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔“

(۲) فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ (المومنون:۱۱۶)

”پس بالا وبرتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی کوئی خدا اس کے سوا نہیں۔مالک ہے عرش بزرگ کا۔“

(۳) اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ڰ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ښ

(الانبیاء:۸۷)

”نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا۔“

(۴) اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (الانبیاء:۲۵)

”میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔“

(۵) اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

(المومنون:۲۳)

”اللہ کی بندگی کرو۔اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے۔کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔“

(۶) قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (ص:۶۵)

"(اے نبیؐ!) ان سے کہو۔ میں تو بس خبردار کردینے والا ہوں۔ کوئی معبود حقیقی نہیں مگر اللہ جو یکتا ہے سب پر غالب۔"

کلمۂ شہادت اَشھدان لاالٰہ الا اللّٰہُ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) اور کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) میں بھی نفی واثبات کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ بھی لاالٰہ الا اللّٰہ ہی کے ہم معنی ہے۔

(ب) خالص اثباتی اسلوب

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (الانبیاء:۱۰۸)

"ان سے کہو، میرے پاس جو وحی آئی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا خدا صرف ایک خدا ہے۔ پھر کیا تم سر اطاعت جھکاتے ہو۔"

(ج) استفہام انکاری کا اسلوب

کسی چیز کا انکار کرنے کے لیے جو سوال کیا جاتا ہے اس کو استفہام انکاری کہتے ہیں۔ یہ عربی زبان کا معروف اور نفی وتردید کا ایک زوردار اسلوب ہے۔ شرک کی نفی کے لیے استفہام انہیں کاموں کو پیش کر کے کیا گیا ہے جن کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ تھا کہ یہ سب کام خدا کے ہیں، ان میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس طرح ایک ایسی حجت قائم ہو جاتی ہے کہ شرک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ صرف ہٹ دھرمی ہی شرک پر قائم رکھ سکتی ہے۔

میں اس کے لیے سورۂ نمل رکوع ۵ آیات ۶۰ تا ۶۴ کے صرف ترجمے پیش کرتا ہوں:

بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے سے وہ خوش نما باغ اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا۔ کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خدا بھی ہے؟ (نہیں) بلکہ یہی لوگ راہ راست سے ہٹ کر چلے جارہے ہیں۔ (۶۰)

اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔ (۶۱)

کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔ (۶۲)

اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوش خبری لے کر بھیجتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خدا بھی ہے؟ بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ (۶۳)

اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔ (۶۴)

ان آیات کی بہترین تشریح تفہیم القرآن ج ۳ میں موجود ہے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

یہ حقیر جب ان آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور بار بار ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (کیا اللہ کے ساتھ کوئی الٰہ ہے) کا سوال سامنے آتا ہے تو دل کی گہرائیوں سے یہ جواب نکلتا ہے کہ نہیں، اللہ کے ساتھ کوئی الٰہ نہیں ہے وہ یکتا و یگانہ ہے۔ اس کی خدائی، اس کی حکومت و سلطنت میں کوئی شریک نہیں ولم یکن له شریک فی الملک (اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ الفرقان ۲) اور نہ وہ اپنی حکومت و فرماں روائی میں کسی کو شریک کرتا ہے۔ ولا یشرک فی حکمه احداً (اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ الکہف ۲۶) جو بھی اس کا دعویٰ کرے کہ اللہ نے ملک کی تدبیر اور اس کا در و بست اس کے حوالے کر دیا ہے یا کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بارے میں یہ بات کہے تو دونوں جھوٹے اور اللہ پر افترا کرنے والے ہیں۔

(د) نہی و ممانعت کا اسلوب

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ

(الذاریت:۵۱)

''اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔''

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (القصص:۸۸)

''اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے، فرماں روائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے۔''

اس ایک آیت میں کتنی باتیں کہی گئی ہیں اور شرک کی اس میں کتنی زبردست نفی ہے۔

(ز) عبادت کو اللہ کے لیے مخصوص کرنے کا اسلوب

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف:۵۹)

''اللہ کی بندگی کرو، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں کو یہی دعوت دی ہے۔ صرف اللہ کی بندگی کی دعوت توحید کی دعوت ہے اور جہاں توحید کی روشنی پہنچی شرک کی تاریکی غائب ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر اُعْبُدُوا اللّٰهَ کے ساتھ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ کا فقرہ نہیں ہے۔ مثلاً سورۂ نوح کی ابتدائی آیتوں میں۔ سورۂ نحل آیت ۳۶ میں ہے کہ اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔ طاغوت سے اجتناب کا حکم مکہ معظمہ ہی میں دیا گیا تھا۔

(ر) سجدہ کو اللہ کے لیے خاص قرار دینے کا اسلوب

سورۂ حٰم السجدہ کی آیت ۳۷ کا ترجمہ یہ ہے:

''اور اس کی نشانیوں میں رات، دن، سورج اور چاند ہیں۔ نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو، اور اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا، اگر تم اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔''

چونکہ سورج اور چاند کو معبود سمجھنے اور ان کو سجدہ کرنے کا شرک قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے اس لیے خاص طور پر ان دونوں کی ممانعت کی گئی اور اللہ کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر اس کی صفت خالقیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں اس صفت کے ذکر نے تمام مخلوق کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ یعنی کوئی مخلوق

خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیاء وہ سجدہ کے مستحق نہیں ہیں۔ سجدے کا حق دار صرف اللہ ہے۔ اخیر کا فقرہ بھی بہت اہم ہے اگر تم اسی کی بندگی کرتے ہو یعنی اگر تم موحد ہو۔ مسلم ہو، صرف اللہ کی بندگی کرنے والے ہو تو اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کرو اور اگر تم موحد نہیں ہو، بندگی میں اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرتے ہو تو پھر جس کو چاہو سجدہ کرو اور جس وادی میں چاہو بھٹکتے رہو۔ شریعت اسلامیہ میں سجدۂ عبادت اور سجدۂ تشریف و تعظیم کی تقسیم غلط ہے۔ غیر اللہ کے لیے ہر قسم کا سجدہ ممنوع ہے۔

(ز) طلب استغفار و توبہ کا اسلوب

شرک و کفر سے باز آنے اور ایمان و اسلام کی طرف پلٹنے کی دعوت کا ایک اسلوب یہ بھی رہا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی قوموں سے استغفار اور توبہ کا مطالبہ کیا ہے۔

حضرت نوحؑ نے اپنی کافر و مشرک قوم سے کہا تھا:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ (نوح:۱۰)

"میں نے کہا، اپنے رب سے معافی مانگو بیشک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔"

سورۂ ہود کی ابتدا میں قرآن کریم کی دعوت یہ ہے:

يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ (ہود:۵۲)

"یہ کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف پلٹو۔"

حضرت ہودؑ نے بھی اپنی کافر و مشرک قوم سے یہی مطالبہ کیا تھا۔

استغفار یہ ہے کہ اپنے کفر و شرک کے ظلم عظیم سے باز آؤ اور اس جرم کی اپنے رب سے معافی چاہو۔ اور توبہ یہ کہ غلط راستے سے پلٹ آؤ اور اس صراط مستقیم پر چلو جو اللہ نے اپنے بندوں کو دکھائی ہے۔

استغفار و توبہ کا مطالبہ کافروں اور مشرکوں سے بھی ہے اور مومنوں اور موحدوں سے بھی۔ کفر و شرک سے استغفار اور بغاوت سے اطاعت کی طرف رجوع تو وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر نجات ممکن ہی نہیں۔

مشرکانہ و کافرانہ خیالات و اوہام اور اقوال و افعال کے ابطال سے بھی مکی سورتیں بھری ہوئی ہیں۔ ہم یہاں بطور مثال چند چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(ح) تقرب الٰہی کا بہانہ یا وہم

یہ بات آثار واخبار اور تاریخ سے ثابت ہے کہ شرک کی ابتدا صالحین کے ساتھ غلوئے عقیدت سے ہوئی۔ یہاں تک کہ ان کے نام کے بت بنا لیے گئے۔ ان کی پرستش شروع ہوگئی اور ان بتوں کے ساتھ طرح طرح کے مشرکانہ خیالات واوہام قائم کر لیے گئے۔ مشرکین عرب نے جن صالحین اور ملائکہ مقربین کے بت بنا لیے تھے ان کی عبادت کرنے کا جو بہانہ انھوں نے پیش کیا وہ سورۂ الزمر کی آیت ۳ میں مذکور ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

> "خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا دوسروں کو کارساز بنا لیا ہے۔ (اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب تر کر دیں۔ اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو۔"

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ قدیم زمانے سے غیر اللہ کی عبادت کے لیے مشرکین، اسی شبہے، بہانے اور وہم پر اعتماد کرتے رہے ہیں کہ ان کے معبودانِ باطل، اللہ کی بارگاہ میں ان کے سفارشی ہوں گے اور ان کو اللہ سے قریب تر کر دیں گے۔ اسی کے ابطال اور تردید کے لیے انبیاء کرام تشریف لاتے رہے۔ یہاں تک کہ نبوت ورسالت حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دی گئی۔ آج بھی مشرکین غیر اللہ کی پرستش اور ان کے لیے مراسم عبودیت کا بہانہ یہی بناتے ہیں۔ مشرکین تو بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ ان زندہ اور مردہ بزرگوں کے سامنے جھکتے ہیں جن کے بارے میں ان کے دل ودماغ میں یہ بات اتار دی گئی ہے کہ وہ ان کی تمام دنیوی واخروی مرادیں پوری کر سکتے ہیں۔ مردہ بزرگوں کی قبروں پر اور زندہ بزرگوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی "وہم" کا نتیجہ ہے۔ اس آیت کریمہ نے فلسفیانہ تصوف کی جڑ بھی کاٹ دی ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس آیت کی موجودگی میں اولیاء کے بارے میں یہ غلط عقیدہ کیوں پیدا ہوا اور کیوں باقی ہے؟ اس کا جواب بھی آیت کے اخیر میں موجود ہے:

> "اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو۔"

اس فقرے کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

"یعنی جس نے دل میں یہی ٹھان لی کہ کبھی سچی بات کو نہ مانوں گا اور ناحق ہی پر ہمیشہ اڑا رہوں گا منعم حقیقی کو چھوڑ کر جھوٹے محسنوں ہی کی بندگی کروں گا۔ اللہ کی عادت ہے کہ ایسے بد باطن کو فوز و کامیابی کی راہ نہیں دیتا۔"

سورۂ زمر کی اس آیت میں مشرکین کے درمیان باہمی اختلاف کا بھی ذکر ہے۔ اس کی تفسیر میں ایک مفسر قرآن نے لکھا ہے:

"یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اتفاق و اتحاد صرف توحید ہی میں ممکن ہے۔ شرک میں کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے مشرکین کبھی اس پر متفق نہیں ہوئے ہیں کہ اللہ کے یہاں رسائی کا ذریعہ آخر کون سی ہستیاں ہیں۔ کسی کے نزدیک تو دیوتا اور دیویاں اس کا ذریعہ ہیں اور ان کے درمیان بھی سب دیوتاؤں اور دیویوں پر اتفاق نہیں ہے۔ کسی کے نزدیک چاند، سورج، مریخ، مشتری اس کا ذریعہ ہیں اور وہ بھی آپس میں اس پر متفق نہیں کہ ان میں سے کس کا کیا مرتبہ ہے اور کون اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ کسی کے نزدیک وفات یافتہ بزرگ ہستیاں اس کا ذریعہ ہیں اور ان کے درمیان بھی بے شمار اختلافات ہیں۔ کوئی کسی بزرگ کو مان رہا ہے اور کوئی کسی اور کو، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مختلف ہستیوں کے بارے میں یہ گمان نہ تو کسی علم پر مبنی ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی ایسی فہرست آئی ہے کہ فلاں فلاں اشخاص ہمارے مقرب خاص ہیں لہٰذا ہم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تم ان کو ذریعہ بناؤ۔ یہ تو ایک ایسا عقیدہ ہے جو محض وہم اور اندھی عقیدت اور اسلاف کی بے سوچے سمجھے تقلید سے لوگوں میں پھیل گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ اس میں اختلاف ہونا ہی ہے۔"

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۳۵۷)

اللہ تعالیٰ نے تو اپنی عبادت اور اپنے رسول کی اطاعت کو اپنے تقرب کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام ذرائع خودساختہ اور باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ میں دعوت دین کے ابتدائی دور ہی فرمادیا تھا:

كَلَّا ۖ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ السجدة (العلق:۱۹)

"ہرگز نہیں، مت مان اس کا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو۔"

نماز اور دعوت حق سے روکنے والوں کی اطاعت نہ کرنا اور صرف خدا کے سامنے

سجدہ ریز ہونا یہ ہے تقریب کا وہ ذریعہ جو اللہ نے خود بتایا ہے۔

(ط) شفاعت کے بارے میں مشرکین کا غلط خیال

مشرکین کا ایک غلط خیال یا عقیدہ، جس نے ان کی بدعملی کے لیے جھوٹا سہارا مہیا کر رکھا تھا یہ تھا کہ ان کے معبودان کی سفارش کر کے ان کو اللہ کے عذاب سے بچالیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے معبود اللہ کے اتنے پیارے یا اتنے زوردار اور بااثر ہیں کہ اللہ ان کی سفارش رد نہیں کرے گا۔ بس ان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو خوش رکھیں۔ یہ غلط عقیدہ برے اعمال کے لیے ڈھال بنا ہوا تھا اور آج بھی بنا ہوا ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی قدرت اور اس کے عدل وانصاف کی نفی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں اس باطل خیال کا بار بار ابطال کیا گیا ہے۔ اس کی تردید کے لیے یہ طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ متعدد آیتوں میں شفیع اور شفاعت کا مطلقاً انکار کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

مَالَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (السجدہ:۴)

"اس کے سوا نہ تمہارا کوئی حامی ومددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے والا۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔"

یہاں شفیع (سفارشی) کا مطلق انکار اس معنے میں ہے کہ تم یہ غلط سمجھتے ہو کہ سفارش کر کے تمہیں کوئی اللہ کے عذاب سے بچالے گا۔ خدا کا نہ کوئی اتنا پیارا ہے اور نہ کوئی اتنا زوردار کہ اس کے قانون عدل میں کوئی خلل پیدا کر سکے اور نہ کوئی ایسا عالم ہے جو اس کے علم میں اضافہ کر سکے۔ وہ خود جانتا ہے کہ کون بخشنے کے لائق ہے اور کون سزاوار سزا ہے۔

سورۂ زمر میں حقیقت شفاعت پر سے یوں پردہ اٹھایا گیا ہے:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (الزمر:۴۴)

"کہو، شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔ پھر اسی کی طرف پلٹائے جانے والے ہو۔"

یہ ہے شفاعت کی حقیقت یعنی کسی کو اس کی بارگاہ میں سفارش کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے الا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ اسے سفارش کرنے کی اجازت دے۔ شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی نفی و

تردید کے لیے مختلف اسلوب اختیار کیے گئے ہیں ایک اسلوب اوپر گزرا۔ دوسرا اسلوب یہ ہے:

''کسی کو اس سے بات کرنے کی مجال نہ ہوگی جس دن روح اور فرشتے قطار باندھ کر کھڑے ہوں گے۔ کوئی بات نہ کرے گا اس کے سوا جس کو رحمٰن اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔'' (النباء: ۳۷، ۳۸)

اس آیت نے واضح کر دیا کہ انسان تو انسان اس دن روح الامین اور دوسرے فرشتوں کو بھی مجال دم زدن نہ ہوگی۔ چہ جائیکہ کوئی کسی کو بخشوانے کے لیے مچل جائے۔ دوسری چیز یہ واضح ہوئی کہ بات وہی کر سکے گا جس کو رحمٰن اجازت دے اور ٹھیک بات کہے گا۔

فرشتوں کے بارے میں مشرکین عرب کا یہ باطل خیال تھا کہ وہ اللہ کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ وہ ان کی عبادت اس لیے کرتے تھے کہ وہ خدا سے ان کی سفارش کریں گی اور خدا اپنی چہیتی بیٹیوں کی سفارش رد نہیں کرے گا۔ ان کے اس وہم کی تردید سورۂ النباء کی اس آیت میں بھی ہے اور سورۂ انبیاء میں تو صراحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے:

''وہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے سب سے باخبر ہے اور سفارش نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اللہ پسند فرمائے اور وہ اس کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں۔'' (الانبیاء: ۲۸)

پہلے فقرے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کا علم سب پر محیط ہے۔ فرشتے اللہ کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ اور نہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے فقرے میں ان کے اس خیال کی تردید ہے کہ فرشتے ان کی سفارش کریں گے۔ خبر یہ سنائی گئی ہے کہ فرشتے صرف ان لوگوں کی سفارش کریں گے جن کے لیے اللہ پسند فرمائے گا لہٰذا فرشتوں کی سفارش پر تمہارا تکیہ کرنا غلط ہے۔ فرشتے کیا ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ اس سلسلے کی بنیادی باتیں سورۂ انبیاء اور دوسری سورتوں میں بیان کر دی گئی ہیں۔ تیسرے فقرے میں کہا گیا ہے کہ تم جن کی سفارش پر تکیہ کیے ہوئے ہو ان کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ خدا کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ سورۂ انبیاء کی آیت ۲۹ میں کہا گیا ہے کہ اگر ان میں کوئی یہ کہے کہ وہ ہی اللہ ہے تو ہم اس کو جہنم میں جھونک دیں گے۔ سورۂ الزخرف میں بھی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے:

''اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ جنھیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے الا یہ کہ کوئی علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔'' (الزخرف: ۸۶)

مشرکانہ عقیدۂ شفاعت کی تردید کا تیسرا اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ کے اذن کے بغیر شفاعت کے نافع ہونے کا انکار کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ کی اجازت کے بغیر تو کوئی کسی کی سفارش نہ کر سکے گا لیکن بالفرض شفاعت کرے بھی تو وہ قبول نہ ہوگی۔ مثلاً سورۂ مدثر میں کہا گیا ہے:

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ ۝ (المدثر:۴۸)

''اس وقت سفارش کرنے والوں کی کوئی سفارش ان کے کسی کام نہ آئے گی۔''

اور سورۂ طٰہٰ میں کہا گیا ہے:

''اس دن شفاعت نفع نہ دے گی۔ الا آنکہ خدائے رحمٰن جس کو اجازت دے اور جس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے۔'' (آیت:۱۰۸)

شفاعت کے غلط عقیدے کی تردید اور اس کے ابطال میں مکی سورتوں کی بھی تمام آیتیں جمع نہیں کی گئی ہیں۔ اس کی تردید پر اتنا زور اس لیے دیا گیا ہے کہ اس عقیدے کے ہوتے ہوئے آخرت ایک بالکل بے معنی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ شفاعت کے اسلامی عقیدے میں اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اس کی رضامندی لازمی ہے۔ نہ تو خدا کا کوئی اتنا پیارا ہے اور نہ اتنا زوردار کہ اس کی سفارش خدا کو قبول ہی کرنی پڑے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کی اتنی شدید و کثیر تردید و ابطال کے باوجود مسلمانوں میں کافروں جیسا عقیدۂ شفاعت کیسے گھس آیا؟ ہر شخص اس کا جواب اپنے فہم اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں دے گا۔ میرا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں میں مشرکانہ عقیدۂ شفاعت فلسفیانہ تصوف نے داخل کیا اور مشرکانہ عقیدۂ شفاعت سے اس کو دو چار ہاتھ آگے بڑھا دیا کیونکہ فلسفیانہ تصوف لوگوں کو اس دنیا ہی میں مغفرت کی بشارت سنا دیتا ہے وہ قیامت کے انتظار کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ قادریہ سلسلہ ہو یا چشتیہ، سہروردیہ سلسلہ ہو یا نقشبندیہ، ہر سلسلے کی کتاب میں اس حقیر نے یہ پڑھا ہے کہ جو ان میں داخل ہوگا وہ بخشا جائے گا۔ مسلمان جس سلسلے میں چاہے داخل ہو جائے مغفرت اور جنت اسے مل جائے گی۔ اللہ ہی سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس مہلک عقیدے کے پھندے سے نجات دے۔ (ماہنامہ زندگی رام پور، جون ۱۹۸۶ء)

اس مضمون کے آخر میں 'باقی' لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا مرحوم اس موضوع پر مزید کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ ان کی وفات سے یہ مضمون ناقص رہ گیا۔ (مرتب)

تحریک اسلامی مدنی دور میں

تحریک اسلامی کا مدنی دور، اسلامی معاشرے کی تعمیر و تنظیم، غلبہ اسلام کے ظہور، دین حق کے پھیلاؤ اور اندرونی و بیرونی دشمنوں سے بچاؤ کا دور تھا۔ ہم اسے تحریک اسلامی کے مکی دور کا نتیجہ اور اس کا حاصل بھی کہہ سکتے ہیں۔

اندرونی ماحول

(۱) مدینۃ النبیؐ میں جس کا پہلا نام یثرب تھا[1] عربوں کے دو بڑے قبیلے اوس وخزرج آباد تھے، ان کے درمیان عرصہ دراز سے جنگ کی آگ بھڑک رہی تھی اور ایسی بھڑک رہی تھی کہ اگر اسلام کا ابر بہاران پر نہ برستا تو یہ آگ انھیں بھسم کر ڈالتی۔ اسلام نے جنگ و جدال کی آگ بجھادی تھی لیکن کچھ چنگاریاں دبی ہوئی موجود تھیں، منافقین ان چنگاریوں کو موقع بموقع کریدنے اور بھڑکانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

(۲) مدینے سے متصل یہودیوں کی بستیاں تھیں جن میں ان کے تین مضبوط قبیلے بنوقینقاع، بنونظیر اور بنوقریظہ آباد تھے۔ یہ قبیلے دینی، علمی اور معاشی حیثیت سے اوس وخزرج پر چھائے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے سودی کاروبار کے جال میں ان دونوں قبیلوں کو جکڑ رکھا تھا۔

بیرونی ماحول

اس وقت کا مدینہ اسلام کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا، جس کو کفر کے بحر مواج نے گھیر رکھا تھا۔ اور اس کی سرکش موجیں اسے ہڑپ کر لینے کے لیے پورا زور لگا رہی تھیں۔ وہ امنڈ امنڈ کر آتیں اور ایمان و یقین کی فولادی دیواروں سے ٹکرا کر واپس جاتیں۔

(۱) یہ نام سورۃ الاحزاب آیت ۱۳ میں استعمال ہوا ہے۔

عناصر

(۱) مہاجرین، جو مکہ کی آزمائشی بھٹی میں تپ کر کندن ہو چکے تھے اور جو وہاں اپنا سب کچھ چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر آئے تھے۔

(۲) انصار، اوس و خزرج کے وہ مسلمان جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے، جن کی دعوت پر حضورؐ مدینہ تشریف لائے تھے۔ اور ایمان جن کے دلوں میں گھر بنا چکا تھا اور جو اسلام کے اتنے شیدائی ہو چکے تھے کہ جب حضورؐ تشریف لائے تو انھوں نے اپنا سب کچھ آپؐ کے قدموں میں لا ڈالا تھا۔ یہی دو گروہ کارفرما گروہ اور تحریک اسلامی کے نہ ہلنے والے ستون تھے۔ انھیں لوگوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر وہ سب کچھ کیا تھا، جس پر آج ہم فخر کرتے ہیں۔

(۳) وہ افراد اور خاندان جو عرب کے مختلف قبیلوں سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے اور خود مدینہ کے وہ افراد اور خاندان جو ایمان تو خلوص سے لائے تھے لیکن جن کے ایمان میں پختگی نہیں آئی تھی اور وہ تربیت کے سخت محتاج تھے۔

(۴) منافقین، یہ لوگ کئی قسموں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں کا بدترین گروہ وہ تھا جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی معاشرے میں گھس آیا تھا تاکہ اندر سے اسے ڈائنامیٹ کرے۔ اس گروہ کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ وہ حقیقتاً اور اصلاً کفار کا دوست اور مسلمانوں کا دشمن تھا۔ یہودیوں کے بھی بہت سے افراد مسلمان بن کر اس گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔

——— منافقین کی دوسری قسم جو عملاً پہلی قسم سے کم مضرت رساں نہ تھی، ان لوگوں پر مشتمل تھی جنھیں حقیقی دل چسپی صرف اپنے ذاتی مفادات سے تھی، وہ سچے دوست نہ کفر کے تھے اور نہ اسلام کے، جب راہ خدا میں جان و مال خرچ کرنے کا موقع آتا تو پیچھے ہٹ جاتے۔ اور جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آتا تو اسے لینے کے لیے سب سے آگے بڑھ آتے۔ اس طرح مدینہ کا اندرون بھی اس کے بیرون سے کم خطرناک نہ تھا۔ کیونکہ اس عنصر سے نمٹنا، کفار کے ساتھ جہاد و قتال سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ یہ تھا مدنی دور کا وہ ماحول جس میں تحریک اسلامی کو کام کرنا پڑا۔

فرائض چہارگانہ

تحریک اسلامی کو ایک طرف اپنے بیرونی دشمنوں سے بچاؤ کرنا تھا، دوسری طرف اندر کے مخالف عناصر سے نمٹنا تھا، تیسری طرف ضعیف الایمان اور غیر تربیت یافتہ مسلمانوں کی تربیت واصلاح کی مہم سر کرنی تھی۔ اور چوتھی طرف مخلص، سرفروش اور مجاہد عناصر کی صلاحیتوں سے کام لینے اور ان کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دینا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرائض چہارگانہ جس طرح انجام دیے اس کی تاریخ دس سال کی مدت پر پھیلی ہوئی ہے اگر مکی دور کے تیرہ سال اس میں شامل کر لیے جائیں تو ۲۳ برسوں کی قلیل مدت میں تحریک اسلامی نے جو کارنامے انجام دیے اس کی نظیر سے پوری انسانی تاریخ خالی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تاریخی معجزہ کس طرح رونما ہوا؟

چھ نکات

مدینہ منورہ میں جو تدابیر اور طریقے اختیار کیے گئے ان سب کو جمع کرنا اور پھر سب پر الگ الگ گفتگو کرنا آسان کام نہیں ہے۔ میں یہاں انھیں چھ نکات میں سمیٹنے کی کوشش کروں گا۔

(۱) دعوت و تبلیغ

فریضۂ شہادت حق ادا کرنے کے لیے بھی اور اپنے بچاؤ کی ایک بہترین تدبیر کے طور پر بھی ضروری تھا کہ دعوت و تبلیغ کا سلسلہ پوری سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا جائے۔ اس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کش مکش کی بنیاد صرف یہ تھی کہ مسلمان ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے، جسے غیر مسلموں کی بہت بڑی تعداد غلط فہمی کی وجہ سے اپنے لیے خطرہ اور داعیان اسلام کو اپنا دشمن سمجھ رہی تھی، اگر ان پر یہ واضح کر دیا جاتا کہ تم جس دعوت کو خطرہ سمجھ رہے ہو وہ خطرہ نہیں بلکہ تمھاری دنیوی اور اخروی نجات کی ضمانت ہے اور جن لوگوں کو تم اپنا دشمن سمجھ رہے ہو وہ تمھارے دشمن نہیں بلکہ حقیقی خیر خواہ اور دوست ہیں تو ان کی دشمنی دوستی میں بدل سکتی تھی۔ اور ان کے سینے اسلام کے لیے کھل سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے خود اپنے تحفظ کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو لوگ انھیں مٹانے کے درپے ہوں وہی ان کے جگری دوست بن جائیں۔ اسلام کی دعوت و تبلیغ نے یہی کام مکے میں بھی انجام دیا تھا اور اس کے

سامنے یہی مہم مدینے میں بھی تھی۔ فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ وہاں دعوت وتبلیغ کے براہ راست مخاطب کفار ومشرکین تھے اور یہاں اس کا رخ اہل کتاب اور منافقین کی طرف پھر گیا تھا۔ مدنی سورتوں میں زیادہ تر یہی لوگ براہ راست دعوت اسلامی کے مخاطب ہیں۔

دعوت اسلامی کے بنیادی نکات اور دین اسلام کے بنیادی عقائد میں کوئی نکتہ اور کوئی عقیدہ ایسا نہ تھا جس کا یہود ونصاریٰ انکار کرتے ہوں وہ بھی اللہ پر، رسولوں پر، آخرت پر اور توریت وانجیل پر ایمان کے مدعی تھے۔ اور جن کتابوں پر وہ ایمان کا دعویٰ کرتے تھے ان میں اللہ کے آخری نبی ورسول کی بعثت کی پیشین گوئی اتنی وضاحت کے ساتھ موجود تھی کہ وہ ان کی آمد وبعثت کے منتظر تھے۔ بلکہ اپنے دشمنوں سے کہا کرتے تھے کہ ایک آخری رسولؐ آنے والے ہیں وہ آجائیں تو ہم ان کے ساتھ مل کر تمھیں مزا چکھائیں گے، لیکن جب وہ آگئے تو انھوں نے ان کا انکار کر دیا۔ اس انکار کے وجوہ واسباب کو خود قرآن نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

قرآن نے ایک طرف تو انھیں اصل دین کی طرف پلٹنے کی دعوت دی ہے جسے انھوں نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور دوسری طرف ان کے عقاید واعمال اور اخلاق وکردار کی ان خرابیوں کی نشان دہی کی ہے جو نسل ہا نسل سے ان میں پرورش پا رہی تھیں۔ ہم یہاں صرف اس اصل دعوت کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں، جو یہود ونصاریٰ کو دی جارہی تھی۔ آل عمران آیت ۶۴ میں ان سے کہا گیا ہے:

> "کہو، اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ
> کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں
> اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے، اگر وہ اس چیز سے
> اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔"

حکمت وموعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت الی اللہ کا یہ ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے ـــــــ جہاں تک منافقین کا تعلق ہے تو وہ زبانی اقرار کی حد تک اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے اس لیے انھیں ایک طرف یہ دعوت دی جاتی رہی کہ سچے دل سے ایمان لاؤ اور اسلام قبول کرو۔ محض زبانی اقرار تمہیں عذاب آخرت سے نجات نہیں دے گا۔ اور دوسری طرف ان کی علامتیں اور ان کی صفات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں تاکہ مخلص مسلمان اپنے ایمان واسلام کا جائزہ لیتے رہیں اور نفاق کی کسی علامت وصفت کو اپنے اندر گھسنے کی اجازت نہ دیں۔

(۲) اعتراضات وشبہات کے معقول جوابات

تحریک اسلامی کے مدنی دور میں زیادہ تر اہل کتاب اور منافقین کے اعتراضات وشبہات کے جوابات دیے گئے ہیں، دعوت اسلامی کے پھیلاؤ اور اس کی مدافعت واستحکام کے لیے ضروری ہے کہ اعتراضات وشبہات کے معقول اور شریفانہ جوابات دیے جائیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر وہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں یا سننے والوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے تو وہ دور ہو جائے۔ اور دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے حق اس طرح واضح ہو کر سامنے آجائے کہ ہر منصف مزاج آدمی یہ سمجھ لے کہ اب اس کے انکار کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اب تو اس کا انکار دھاندلی اور ہٹ دھرمی ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کو قرآن نے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے، ہدایت، گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے) کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ اہل کتاب یا منافقین نے جو اعتراضات کیے ہیں یا جن شبہات کا اظہار کیا ہے ان کا بڑا حصہ اسلامی شریعت کے احکام وقوانین سے متعلق ہے۔ مثال کے طور پر تحویل قبلہ کا حکم۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو سولہ سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ اب کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرو، اسی حکم کو تحویل قبلہ کا حکم کہتے ہیں۔ اس حکم پر اعتراض وجواب دوسرے پارہ کے شروع میں موجود ہے۔ اسی طرح متبنیٰ (لے پالک) کی بیوی سے نکاح حلال ہونے کا حکم ہے۔ اس پر اعتراض و جواب سورۃ الاحزاب میں موجود ہے۔ یہود کے غصے اور حسد کا پارہ اس قدر چڑھ گیا تھا کہ کبھی کبھی وہ ایسی بات کہہ گزرتے تھے جس کی زد خود ان کے اپنے عقیدے پر پڑتی تھی۔ قرآن نے ایسے موقع پر انہیں ان کا اپنا عقیدہ یاد دلا دیا ہے۔

> ''ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا، جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔ ان سے پوچھو، پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور کچھ چھپا جاتے ہو اور جس کے ذریعہ تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل اور نہ تمہارے باپ دادا کو، آخر اس کا نازل کرنے والا کون تھا؟ بس اتنا کہہ دو کہ اللہ، پھر انہیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دو۔'' (الانعام:۹۱)

قرآن کا یہ جواب سن کر ان لوگوں نے بھی جن سے یہودیوں نے کہا تھا کہ ''اللہ نے کسی

بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے" سمجھ لیا ہوگا کہ یہودی بڑے جھوٹے ہیں۔ جب وہ خود موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ورسالت پر ایمان کا دعویٰ کرتے اور توریت کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں تو پھر وہ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے کسی انسان پر وحی نازل نہیں کی، اس کے علاوہ خود یہودی عوام نے بھی اپنے علماء ومشائخ کی دھاندلی محسوس کرلی ہوگی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے جوش میں سرے سے رسالت ونبوت ہی کا انکار کیے دے رہے تھے۔

(۳) عملی شہادت

جس چیز نے دعوت اسلامی کی اثر انگیزی کو ناقابل بیان حد تک بڑھا دیا تھا وہ داعیان اسلام کی عملی شہادت تھی، ان کی دعوت وتحریک کا حسن ان کی اپنی زندگیوں کے آئینوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ خود اسلامی تعلیمات کے چلتے پھرتے نمونے بن گئے تھے، وہ جدھر نکل جاتے ان کے ایمان ویقین اور اخلاق وکردار کی خوشبو سے فضا مہک اٹھتی۔

انھوں نے توحید کی دعوت دی تو ان کی اپنی زندگیوں سے شرک اور اس کی تمام تاریکیاں اس طرح دور ہوگئیں جس طرح سورج کی روشنی سے رات کے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے بندگی رب کی دعوت دی تو خود اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے سامنے جھک گئے، انہوں نے اطاعت رسول کی دعوت دی تو خود اس کا بے مثال عملی ثبوت بھی پیش کیا ——— کفار ومشرکین ہوں یا یہود ونصاریٰ یا منافقین، کسی سے بھی انھیں ذاتی پرخاش نہ تھی، کسی سے بھی کوئی قومی جنگ نہ تھی، کسی سے بھی نسل ونسب ورنگ کی لڑائی نہ تھی، کسی سے بھی مال ودولت اور جاہ ومنصب کے حصول کی کش مکش نہ تھی، ان پر ہر طرف سے جو حملے ہو رہے تھے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے جو پھیلتی چلی جارہی تھی۔ دشمنان اسلام کے ہر گروہ کا برسر اقتدار طبقہ دیکھ رہا تھا کہ زمین اس کے پیروں کے نیچے سے سرکتی چلی جارہی ہے اس لیے وہ اپنے ناجائز تخت اقتدار کو بچانے کے لیے اچک اچک کر حملے کر رہا تھا۔ اس کی ماؤف عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کفر ومعصیت کی تاریکی، ایمان واطاعت کی روشنی پر کبھی غالب نہیں آسکتی۔

(۴) صبر واستقامت

اس بات پر عقل اور تاریخ دونوں شاہد ہیں کہ کوئی خالص دنیوی تحریک بھی مصائب و

مشکلات پر صبر، اپنے مقصد و موقف پر جماؤ، ایثار و قربانی، اخوت اور باہمی مرحمت و مواسات کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی تو پھر یہ کس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ تحریک اسلامی جو دنیا اور آخرت دونوں کو اپنے دائرے کے اندر لیے ہوئے ہے ان صفات کے بغیر کامیاب ہو جائے گی۔ اس تحریک کی کامیابی کے لیے کسی بھی دنیوی تحریک کے مقابلہ میں یہ صفات زیادہ ضروری ہیں بلکہ اس تحریک کے داعیوں اور کارکنوں میں انہیں بدرجہ کمال موجود ہونا چاہیے۔ قرآن، احادیث اور تاریخ سبھی گواہ ہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخلص ساتھیوں میں دوسری اعلیٰ صفات کے ساتھ یہ صفات بھی بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ ان کے صبر اور استقامت علی الحق کا حال یہ تھا کہ مصائب و مشکلات کی سیاہ آندھیاں اور ان کے تیز و تند جھکڑ بھی ان کے قدموں میں لغزش پیدا نہ کر سکے، ان کے ایثار و قربانی کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اپنی کوئی چیز بچا کر نہ رکھی تھی، اپنا سب کچھ اقامت دین کی جدوجہد میں لگا دیا تھا، ان کی اخوت اسلامی کا حال یہ تھا کہ مدنی دور کے شروع میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا اور مہاجرین کو انصار کے مال و جائداد اور وراثت تک میں شریک کر دیا تو انھوں نے اسے پوری خوش دلی اور مسرت و شادمانی کے ساتھ قبول کیا۔ لیکن مہاجرین بھی وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو ان پر بوجھ نہیں بننے دیا، ان کے باہمی مرحمت و مواساۃ کا حال یہ تھا کہ خود پروردگار عالم نے انھیں ''رُحَمَاءُ بینھم'' کی سند عطا کی، ان اشارات کی تفصیل جاننے کے لیے سیر و سوانح کی مستند کتابیں پڑھنی چاہئیں۔

(۵) تعلیم و تذکیر

جیسا کہ ابتدائی سطروں میں عرض کیا گیا، تحریک اسلامی کا مدنی دور اسلامی معاشرے کی تعمیر اور اس کے استحکام کا دور تھا، مکی دور میں قرآن کریم نے اسلامی معاشرے کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا تھا اب اس کی تکمیل کا وقت آگیا تھا، زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں ضابطے اور قوانین نازل ہو رہے تھے، عبادات و معاملات، معیشت و معاشرت، تہذیب و تمدن، حدود و تعزیرات، بین الاقوامی تعلقات، صلح و جنگ، سیاست و حکومت، غرض تمام مسائل زندگی کے بارے میں حسب موقع مسلسل اور پے در پے آیتیں نازل ہو رہی تھیں، ان سب کی توضیح و تشریح کرنا، انھیں نافذ کرنا اور انھیں کے مطابق اسلامی معاشرے کی تعمیر کرنا اور اسے مستحکم بنانا کوئی آسان کام نہ تھا،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کارنامہ اپنی بے مثال پیغمبرانہ بصیرت وقیادت، بے نظیر تعلیم وتذکیر، تذکیہ وتطہیر اور کمزوریوں کی نشان دہی اور ان کی اصلاح کے ذریعہ انجام دیا۔ آپ نے اپنے مخلص اور سرفروش ساتھیوں کی رہنمائی فرمائی اور اپنے کمزور ساتھیوں کو سہارا دیا اور انھیں اس سطح پر لے آئے کہ وہ بھی اسلامی معاشرے کے لیے کارآمد عنصر بن گئے۔

قرآن کی آیات، ذخیرۂ احادیث اور سیر وسوانح کی کتابوں میں حضورؐ کے اس عظیم کارنامے کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ اور ہر پڑھا لکھا آدمی اس سے واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔ ہم اس مختصر تقریر میں کسی ایک شق کی تفصیل پیش کرنے سے بھی قاصر ہیں۔

(٦) بیدار مغزی اور اپنے بچاؤ کی بروقت تدابیر

اسلام کے دشمنوں اور دوستوں، دونوں نے محمد عربی فداہ امی وابی کو ہمیشہ ایک بیدار مغز سربراہ، اپنے بچاؤ کی بروقت تدابیر اختیار کرنے والا، زبردست منتظم اور صلح وجنگ کا بہترین قائد پایا ہے۔ ایک طرف آپ اللہ پر توکل کرنے والوں کے سردار تھے اور دوسری طرف کسی جنگ کی کامیابی یا کسی معاملہ کی انجام دہی میں ہر ضروری تدبیر اختیار فرماتے تھے۔ آپ کی تعلیم اور آپ کا اسوہ دونوں یہ بتاتے ہیں کہ توکل کے معنی ترک اسباب کے نہیں ہیں بلکہ اسباب پر اعتماد کے ہیں۔ آپ جب ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو کسی تاخیر کے بغیر یہودی قبائل، مہاجرین و انصار اور ان کے خاندانوں کو شامل کرکے معاہدات کی ایک دستاویز مرتب کرائی جس کی اہم ترین دفعہ یہ تھی کہ اگر اس معاہدے کے پابند لوگوں کے درمیان کوئی نزاع یا اختلاف پیدا ہو تو اس کا آخری فیصلہ آپ کریں گے جو سب کے لیے واجب التعمیل ہوگا۔ اس دستاویز سے ایک باضابطہ اسلامی ریاست بھی وجود میں آئی اور یہودی قبائل کی طرف سے تحفظ بھی حاصل ہوا یہی نہیں بلکہ آپ نے مدینہ کے آس پاس کے قبائل سے بھی معاہدات کی داغ بیل ڈال دی اور اس میں پوری کامیابی حاصل کی۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان یا خود مسلمان قبیلوں کے درمیان کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ یا ہنگامہ بھی اٹھ کھڑا ہوتا تو آپ فوراً اس کا نوٹس لیتے اور بہ نفس نفیس اسے باحسن وجوہ فرد کردیتے۔ ایک بار جب مدینہ میں یہ افواہ اڑی کہ رومیوں کی زبردست فوج مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے قریب آپہنچی ہے اور اس افواہ نے مدینہ میں ایک انتشار اور خلفشار کی کیفیت پیدا کی تو تاریخ کی آنکھ نے یہ بھی دیکھا کہ خود محمد رسول اللہؐ

گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار مدینہ کی گلیوں میں گشت لگا رہے ہیں اور لوگوں کو مطمئن فرما رہے ہیں۔

تحریک اسلامی کا مدنی دور ہمارے لیے روشنی کا ایک مینار ہے

عام طور سے اہل علم کہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو صورت حال ہے اس کی مشابہت دعوت اسلامی کے مکی دور سے ہے۔ مدنی دور سے نہیں ہے۔ لیکن تاریخ ان کے اس خیال کی تائید نہیں کرتی، وہ یہ بتاتی ہے کہ ہماری مشابہت مدنی دور سے زیادہ اور مکی دور سے کم ہے۔ مکی دور سے ہماری مشابہت صرف ایک جز میں ہے اور وہ یہ کہ ہمارے پاس مدنی دور کی طرح کوئی اسلامی حکومت موجود نہیں ہے اور بس۔ اس کے علاوہ ہمارے حالات کے تمام اجزاء مدنی دور سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ دور بھی مکی دور ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ہمارے لیے روشنی کا ایک مینار ہے۔

(ماہ نامہ زندگی رام پور، ستمبر ۱۹۷۰ء)

غیر مسلموں میں دعوتی کام

مدنی دور میں

بعثت سے لے کر وفات سے قریبی زمانے تک سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اترتا رہا اس لیے مکہ اور مدینہ دونوں ہی میں دعوتی سرگرمیوں کا محور و مرکز قرآن ہی رہا۔ وہی حسب موقع انسانی گروہوں کو مخاطب کرتا، دعوت کا رخ متعین کرتا اور ساتھ ہی طریق دعوت کی رہنمائی بھی کرتا۔ اگر ہم مکہ اور مدینہ کی دعوتی سرگرمیوں کو جاننا چاہتے ہوں تو اس کا اصل ماخذ قرآن ہی ہوگا۔ مدنی سورتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب موقع دعوتی سرگرمیوں کا رخ اہل کتاب اور منافقین کی طرف مڑ گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جہاں تک کفار و مشرکین کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کا تعلق ہے مکے میں تیرہ برس تک اصلاً وہی اس کے مخاطب تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مدینہ آ کر تحریک اسلامی کو اہل کتاب اور منافقین ہی کے درمیان کام کرنا تھا اس لیے قدرتی طور پر وہی اس کے مخاطب ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلی مدنی سورۃ البقرہ میں بہ صراحت یہ بات کہی گئی ہے کہ ہدایت گمرہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے یعنی اب یہ جاننا بالکل آسان ہو گیا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور گمرہی کیا ہے؟ ان دونوں کے درمیان کوئی التباس اور اشتباہ باقی نہیں رہا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ:

> ''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمرہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط رسی پکڑی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔'' (البقرہ:۲۵۶)

مدینہ منورہ میں اصل مخاطب بدل گئے تھے لیکن دعوت اور طریق دعوت میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں پیدا نہیں ہوئی تھی اسلام کے بنیادی عقائد اور بنیادی اقدار مکہ میں بھی دعوت اسلامی

کے محور تھے اور مدینہ میں بھی وہی محور رہے کیونکہ ان میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اہل کتاب کو جو اصل دعوت دی جارہی تھی وہ یہ تھی:

> ''کہو، اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھیرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھیرائے۔ اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔'' (آل عمران: ۶۴)

حکمت و موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت الی اللہ کا یہ ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس آیت میں اس خالص توحید کی دعوت دی گئی ہے جو دعوت اسلامی کا مرکزی نقطہ ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

> بحث کا یہ طریقہ قرآن کے اس قرار دادہ طریقے کے بالکل مطابق ہے جس کی اس نے آیت ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ (اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے دعوت دو) میں تلقین فرمائی ہے۔ اس طریقۂ حکمت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اگر مخاطب سے بحث کے لیے کوئی مشترک بنیاد مل سکتی ہو تو اسی پر گفتگو کو آگے بڑھایا جائے خواہ مخواہ اپنی انفرادیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ قرآن نے یہاں یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ اہل کتاب آسمانی صحیفوں کے حامل ہونے کے سبب سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح آشنا بھی تھے اور اس کے علم بردار ہونے کے مدعی بھی۔ ان کے صحیفوں میں نہایت واضح الفاظ میں توحید کی تعلیم موجود تھی۔ انھوں نے اگر شرک اختیار کیا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تھی بلکہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات کے بالکل خلاف محض بدعت کی راہ سے۔ انھوں نے یہ چیز اختیار کی۔ قرآن نے ان کو دعوت دی کہ یہ بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مسلم ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کی جائے، نہ اس کا کسی کو ساجھی ٹھیرایا جائے اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب ٹھیرائے۔ پھر اس مسلم و مشترک حقیقت کے برخلاف تم نے خدا کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیوں بنا رکھا ہے اور اپنے احبار و رہبان اور فقیہوں، صوفیوں کو اربابا من دون اللہ کا درجہ کیوں دے دیا۔
>
> اسی نقطے سے بحث کا آغاز کیا ہے اور پھر بتدریج اس کے تقاضے اور لوازم واضح فرمائے

ہیں اور جو چیزیں اس کے تقاضوں کے خلاف اہل کتاب میں پیدا ہو گئی تھیں ان کی تردید
فرمائی ہے...... اس آیت کے آخر میں بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ سے اس حقیقت کی طرف
اشارہ ہو رہا ہے کہ یہی توحید اس سپردگی اور حوالگی کی روح ہے جس سے اسلام عبارت
ہے اور جو اصل مطلوب و مقصود ہے۔ جس کو یہ توحید حاصل نہیں اس کو اسلام حاصل نہیں
اور جس کو اسلام حاصل نہیں اس کو خدا حاصل نہیں۔ (تدبر قرآن ج ۱ ص ۷۱۵-۷۱۶)

اس آیت میں حکیمانہ دعوت کا ایک قابل لحاظ پہلو یہ بھی ہے کہ صرف مخاطبین کو نصیحت نہیں کی گئی ہے بلکہ اس نصیحت میں اپنے آپ کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔ یوں نہیں کہا گیا ہے کہ تم ایسا نہ کرو اور تم ایسا نہ کرو، بلکہ یوں کہا گیا ہے کہ ہم ایسا نہ کریں اور ہم ایسا نہ کریں۔

مدنی سورتوں میں کفار و مشرکین کو جو دعوت دی گئی ہے وہ وہی ہے جو مکے میں دی گئی تھی۔ سورۂ البقرہ میں جو سب سے پہلی مدنی سورہ ہے اس کی ابتدا میں یاایُّھاالنَّاسُ کے خطاب عام سے دعوت دی گئی ہے جس میں کفار و مشرکین بھی داخل ہیں بلکہ اس خطاب کے بعد جو کچھ کہا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل مخاطب کفار و مشرکین ہی ہیں، فرمایا گیا ہے:

اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو، اس کی بندگی جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل، تمہاری روزی کے لیے تو تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھہراؤ درآں حالیکہ تم جانتے ہو۔ اگر تم اس چیز کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی سورۂ اور بلا لو اپنے حمایتوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر، جو تیار ہے کافروں کے لیے۔ (آیات ۲۱ تا ۲۴)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ مدینہ آکر بھی جب کہ ایک اسلامی حکومت بن گئی تھی کفار و مشرکین کو بندگی رب کی وہی دعوت دی گئی ہے جو تیرہ سال تک مکے میں دی جاتی رہی تھی اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ ان آیتوں میں اس بندگی رب کی دعوت دی گئی ہے جو قرآن پیش کر رہا تھا اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں اس قرآن کے کلام اللہ ہونے میں شک ہے تو اس کے مثل کوئی سورہ بنا لاؤ۔ اصل یہ ہے کہ بندگی رب کے مدعی تو اس وقت کے مشرکین بھی تھے اور آج کے بھی

ہیں۔ اسلام اس بندگی رب کی طرف بلاتا ہے جس کی تعیین وتشریح قرآن نے کی ہے اور جس کا اسوہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔

سورۂ البقرہ ہی میں آیت ۱۲۴ سے ۱۳۳ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے خاندان اور تعمیر کعبہ کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں مشرکین عرب اور اہل کتاب دونوں ہی کے لیے اسلام کی بہترین دعوت موجود ہے

قرآن کریم میں غیر مسلموں کو جو دعوت دی جا رہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول و عمل سے اس کی تبیین وتشریح فرماتے تھے۔ مثلاً سورۂ توبہ رکوع ۵ میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب نے احبار ورہبان کو رب بنالیا اس کے بارے میں حضرت عدی بن حاتم (اسلام لانے سے پہلے یہ عیسائی تھے) نے اس شبہے کا اظہار کیا کہ ہم نے احبار ورہبان کو اپنا رب تو نہیں بنایا پھر یہ بات کیسے کہی گئی؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سوال کیا "کیا یہ بات نہیں ہے کہ جس چیز کو وہ حرام ٹھہرادیں تم اس کو حرام ٹھہرادیتے ہو اور جس چیز کو حلال ٹھہرادیں اس کو حلال؟" انھوں نے اقرار کیا کہ یہ بات تو ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہی ان کو رب بنادینا ہے۔ اس تشریح سے ان کا شبہہ بھی دور ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی کی ایسی اطاعت کی جائے کہ اس کے لیے تحریم وتحلیل کا حق تسلیم کرلیا جائے تو فی الواقع یہ چیز اس کی عبادت کرنے کے ہم معنیٰ ہے اگرچہ بظاہر اس کو سجدہ و رکوع کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اسلام قبول کرنے کی شخصی وانفرادی دعوت

اس کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ اسلام کا تعارف ہوجانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسلام قبول کرلینے کی شخصی وانفرادی دعوت دیتے تھے۔

> حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی نوجوان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا۔ وہ بیمار ہوا تو آپؐ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ اس کے سرہانے بیٹھے اور اسلام لانے کی دعوت دی۔ فرمایا کہ تم مسلمان ہوجاؤ۔ یہ سن کر اس نوجوان نے اپنے یہودی باپ کی طرف دیکھا جو وہاں پر موجود تھا۔ باپ نے اپنے لڑکے سے کہا کہ ابوالقاسم (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ہے) کی اطاعت کرو۔ اس کے بعد وہ نوجوان مسلمان ہوگیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہوئے وہاں سے

رخصت ہوئے۔"شکر ہے اس اللہ کا جس نے اسے جہنم کی آگ سے نجات بخشی۔" (مشکوۃ بحوالہ بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی غیر مسلم کو اسلام کا تعارف کرایا جائے اور اس سے قریبی تعلقات پیدا ہو جائیں تو بالکل راست انداز میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جا سکتی ہے۔

دعوت و تبلیغ کے لیے وفود کی روانگی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کسی ایک صحابی کو اور کبھی صحابہ کرام کی ایک جماعت کو دعوت و تبلیغ کے لیے مدینے سے باہر بھیجا کرتے تھے۔ میں یہاں ایسے دو وفد کے واقعات نقل کرتا ہوں:

"بیہقی میں باسناد صحیح حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے حضرت خالد بن ولید کو اہل یمن کی طرف بھیجا تا کہ ان کو اسلام کی دعوت دیں۔ حضرت براء کہتے ہیں کہ ہم لوگ چھ مہینے تک اسلام کی دعوت دیتے رہے، کسی نے قبول نہ کیا۔ تب حضورؐ نے حضرت علیؓ کو بھیجا۔ اور حضرت خالد کو واپس بلایا مگر کہہ دیا کہ خالد کے ساتھیوں میں سے جو علیؓ کے ساتھ رہنا چاہے وہ رہ جائے۔ اس لیے میں رہ گیا۔ اس کے بعد جب ہم قوم کی طرف پہنچے تو وہ ہماری طرف نکلے ہم لوگوں نے نماز پڑھی۔ حضرت علیؓ نے امامت کی اور ہم سب ایک صف میں کھڑے ہوئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھ کر سنایا تو سارے کے سارے ہمدانی مسلمان ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے ان کے اسلام کی خبر رسول اللہؐ کو لکھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ خط پڑھا تو سجدے میں گر گئے۔ پھر آپ نے سجدے سے سر اٹھایا اور فرمایا: السلام علی همدان ،السلام علی همدان۔ ابن قیم کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند صحیح ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔"

(اصح السیر مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری ص ۴۶۶)

اس واقعے سے اس جدوجہد کا اندازہ ہوتا ہے جو دعوت اسلامی کی اشاعت اور لوگوں کو قبول حق پر آمادہ کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرتے تھے اور اسی کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لیے اس جذبہ شکر و سپاس کا پتہ بھی چلتا ہے جو کسی کے قبول حق کے بعد حضورؐ کے قلب مبارک میں پیدا ہوتا تھا اور اس شفقت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے جو اسلام قبول کرنے والوں کے لیے آپ کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ یہ اضطراب، یہ شکر و سپاس اور یہ شفقت

وراثت ہی وہ چیزیں ہیں جو دعوت اسلامی میں پر پرواز پیدا کرتی ہیں۔

دوسرا واقعہ قبیلۂ بنو سعد بن بکر کے گاؤں میں کسی صحابی کو تبلیغ اسلام کے لیے بھیجنے کا ہے۔ حضورؐ نے اپنے کسی صحابی کو وہاں اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیجا انھوں نے جو دعوت انہیں پہنچائی اس کی تصدیق کے لیے اس قبیلے نے اپنے ایک عاقل و فہیم فرد حضرت ضمام بن ثعلبہ کو اپنا نمائندہ بنا کر مدینہ بھیجا۔ انھوں نے مدینے پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو گفتگو کی اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے اس کا ترجمہ یہ ہے:

''ہمارے پاس آپ کے قاصد پہنچے، ان کا خیال ہے کہ آپ اپنے آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ میرے قاصد نے سچ کہا۔ پھر انہوں نے کہا۔ آسمان کس نے پیدا کیا؟ فرمایا اللہ نے۔ کہا، زمین کس نے پیدا کی، فرمایا۔ ''اللہ نے۔'' کہا ان پہاڑوں کو کس نے کھڑا کیا اور ان میں بہت سی چیزیں کس نے پیدا کیں؟ فرمایا اللہ نے! کہا تو پھر قسم ہے اس کی جس نے آسمان و زمین پیدا کیے اور پہاڑوں کو جمایا، کیا اللہ نے آپ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا۔ ہاں۔ کہا آپ کے قاصد کا خیال ہے کہ رات دن میں ہم پر پانچ نمازیں فرض ہیں؟ فرمایا اس نے سچ کہا۔ تب انھوں نے کہا قسم ہے اس رب کی جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں، اسی طرح کے سوالات انھوں نے زکوٰۃ، رمضان کے روزوں اور حج کے بارے میں بھی کیے۔ پھر حضورؐ کی خدمت سے واپس جاتے ہوئے انھوں نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا۔ میں ان فرائض پر نہ کچھ اضافہ کروں گا اور نہ ان میں کچھ کم کروں گا۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ بعض دوسری روایتوں میں سوال و جواب کے الفاظ کچھ بدلے ہوئے ہیں اور بعض میں یہ اضافہ ہے کہ جب وہ اپنے قبیلے کے پاس پہنچے تو لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے اور سب سے پہلی بات جو ان کے منھ سے نکلی وہ یہ تھی۔ برا ہو لات و عزیٰ کا۔ لوگوں نے کہا۔ اے ضمام ایسا نہ کہو۔ برص، جذام اور جنون سے ڈرو۔ انھوں نے کہا تمہاری خرابی ہو خدا کی قسم لات و عزیٰ نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ اللہ نے ایک رسول مبعوث فرمایا ہے اور ایک کتاب نازل کی ہے جس کے ذریعے اس نے تمھیں ان برائیوں سے نجات بخشی ہے جن میں

تم مبتلا تھے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے وہ یگانہ و یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں وہاں سے تمہارے لیے وہ پیغامات لایا ہوں جن کا انھوں نے تمہیں حکم دیا ہے جن سے منع کیا ہے۔ راوی حدیث قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اس دن کی شام بھی نہ ہوئی تھی کہ قبیلے کے تمام مرد اور عورتیں مسلمان ہو گئے۔ راوی حدیث ابن عباس کہتے ہیں کہ ہم نے نہیں سنا کہ کسی قبیلے کے وفد میں کوئی آنے والا شخص ضمام بن ثعلبہؓ سے افضل ہو۔'' (جمع الفوائد)

عہد رسالت کے مدنی دور میں دعوت اسلامی کی اشاعت کے لیے یہ تھی جدوجہد، یہ تھا جوش و خروش اور یہ تھی اثر انگیزی۔

رئیسوں اور بادشاہوں کے نام فرامین رسالت

۶ ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد جب وہ سلسلہ جنگ کچھ دنوں کے لیے بند ہوا جو کفار مکہ نے مسلمانوں کے خلاف چھیڑ رکھا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سربراہان مملکت کے نام باضابطہ فرامین بھیجے۔ یہ دعوت اسلامی اور سیرت نبوی کا ایک وسیع باب ہے۔ اگر ہم تمام تفصیلات یہاں پیش کریں تو یہ مختصر مقالہ ایک کتاب کی ضخامت اختیار کرے گا۔ اس لیے ہم اختصار کے ساتھ اس کا اجمالی خاکہ یہاں پیش کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ سے واپس مدینے تشریف لائے تو محرم ۷ ھ میں مختلف ملکوں اور چھوٹی ریاستوں کے سربراہوں کے نام اپنے فرامین دے کر ایک ہی دن میں آپ نے چھ قاصد روانہ کیے۔ حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبیؓ کو قیصر روم کے پاس۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ کو کسرائے ایران کے پاس۔ حضرت حاطب بن بلتعہؓ کو بادشاہ مصر کے پاس۔ حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کو شاہ حبشہ کے پاس۔ حضرت شجاع بن وہب الاسدیؓ کو حارث بن ابی شمر غسانی کے پاس جو بلقاء کا رئیس اعظم تھا۔ حضرت سلیط بن عمرو کو ہوزہ بن علی الحنفی کے پاس۔

جب آپؐ نے ان رئیسوں اور بادشاہوں کے پاس خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو عرض کیا گیا کہ ملوک و سلاطین ایسے خطوط قبول نہیں کرتے اور نہ پڑھتے ہیں جن پر بھیجنے والے کی مہر نہ ہو۔ اس لیے حضورؐ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی جس میں اپنا اسم مبارک اس طرح کندہ کرایا کہ

پہلی سطر میں محمد، دوسری میں رسول اور تیسری میں اللہ لکھا تھا۔ پھر اسی سے اپنے فرامین پر مہریں لگوائیں۔ آپ نے ہرقل، قیصر روم کے پاس جو فرمان بھیجا تھا اس کا ترجمہ یہ ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد رسول اللہ کی طرف سے سردار روم ہرقل کے نام۔ اس شخص پر سلام جو راہ راست کی پیروی کرے۔ امابعد، میں تم کو کلمہ اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کرلو، سلامت رہو گے اور خدا تم کو دوہرا اجر دے گا اور اگر تم نے روگردانی کی تو تمہاری جاہل رعایا کا گناہ تم پر ہوگا۔ اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔ اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔''

پرویز بن ہرمز کسرائے فارس کے نام جو فرمان گیا تھا اس کا ترجمہ یہ ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے سردار فارس کے نام۔ سلام ہو اس پر جو راہ راست کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس بات کی گواہی دے کہ اللہ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ میں تمام انسانوں کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ میرے ذریعے اللہ ہر متنفس کو ڈرا دا سنادے اور کافروں پر حجت قائم ہو جائے۔ اسلام قبول کرو۔ سلامت رہو گے۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو سارے مجوس کا وبال تم پر ہوگا۔''

یہ دونوں فرامین اس دعوت اسلامی کا نمونہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط کے ذریعے بادشاہوں تک پہنچائی تھی۔

چھ قاصد تو وہ تھے جو ایک ہی دن روانہ کیے گئے تھے۔ ان کے علاوہ حضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں دس اور قاصد، دس مختلف سربراہوں کے پاس بھیجے تھے۔ ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیرۃ العرب اور آس پاس کا کوئی قابل ذکر رئیس اور بادشاہ ایسا نہ تھا جس کو آپ نے خط کے ذریعے دعوت نہ دی ہو۔

اس اجمالی خاکے سے بھی خطوط کے ذریعے اس دعوتی کام کا اندازہ ہوتا ہے جو مدنی دور

میں انجام دیا گیا۔ اس زمانے میں جب کہ راستے بہت دشوار گزار اور پر خطر تھے۔ مدینہ منورہ سے دور دراز علاقوں تک قاصدوں کے سفر میں جو مشکلات و خطرات پیش آئے ہوں گے ان کا اندازہ اس وقت بھی کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کی دعوت عمل کی زبان سے

جس چیز نے دعوت اسلامی کی اثر انگیزی کو ناقابل بیان حد تک بڑھادیا تھا وہ داعیان اسلام کی عملی شہادت اور اخلاق و کردار کی زبان سے اسلام کی دعوت تھی۔ ان کی دعوت و تحریک کا حسن ان کی اپنی زندگیوں کے آئینوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ خود اسلامی تعلیمات کے چلتے پھرتے نمونے بن گئے تھے، وہ جدھر نکل جاتے ان کے ایمان و یقین اور اخلاق و کردار کی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی۔

انھوں نے توحید کی دعوت دی تو ان کی اپنی زندگیوں سے شرک اور اس کی تمام تاریکیاں اس طرح دور ہو گئیں جس طرح سورج کی روشنی سے رات کے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے بندگی رب کی دعوت دی تو خود اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے سامنے جھک گئے۔ انھوں نے اطاعت رسول کی دعوت دی تو خود اس کا بے مثال عملی ثبوت بھی پیش کیا۔ کفار و مشرکین ہوں یا یہود و نصاریٰ یا منافقین کسی سے بھی انہیں ذاتی پرخاش نہ تھی، کسی سے بھی کوئی قومی جنگ نہ تھی، کسی سے بھی نسل و نسب اور رنگ کی لڑائی نہ تھی۔ کسی سے بھی مال و دولت اور جاہ و منصب کے حصول کی کش مکش نہ تھی، ان پر ہر طرف سے جو حملے ہو رہے تھے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے جو پھیلتی چلی جارہی تھی۔ دشمنان اسلام کے ہر گروہ کا برسر اقتدار طبقہ دیکھ رہا تھا کہ زمین اس کے پیروں کے نیچے سے سرکتی جارہی ہے اس لیے وہ اپنے ناجائز تخت اقتدار کو بچانے کے لیے اچک اچک کر حملے کر رہا تھا۔ اس کی ماؤف عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کفر و معصیت کی تاریکی۔ ایمان و اطاعت کی روشنی پر کبھی غالب نہیں آسکتی۔

اقتدار اور طاقت حاصل ہونے سے پہلے زندگی کے ہر معاملے اور ہر پہلو میں حسن اخلاق و کردار کی قولی و لفظی دعوت آسان ہے لیکن حصول اقتدار کے بعد عمل کی زبان سے اسلامی تعلیمات و اخلاقیات کی دعوت دینا بہت مشکل ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ دعوت اسلامی میں اثر انگیزی جتنی عملی دعوت و شہادت سے پیدا ہوئی ہے اتنی محض قولی دعوت سے نہیں پیدا ہوتی۔ مدنی دور میں عمل

کی زبان سے جو دعوت دی گئی فی الواقع اس نے پورے جزیرۃ العرب کو اسلامی علم کے نیچے جمع کر دیا۔ اسلامی تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد جس تیزی سے اسلام پھیلا وہ اس سے پہلے نہیں پھیلا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ صلح کے بعد خود مکہ والوں کو مدینہ آ کر، حکومت و اقتدار کے ماحول میں مسلمانوں کو جانچنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور انھوں نے اس کا تجربہ کیا کہ یہ لوگ زبان سے جس چیز کی دعوت دیتے ہیں ان کا عمل بھی اس پر گواہی دیتا ہے۔ اس تجربے نے انہیں احساس دلایا کہ جس چیز کے خلاف وہ لڑ رہے ہیں وہ کتنی اچھی ہے اور وہ کتنی بڑی سعادت ہے جس سے اب تک اپنے آپ کو محروم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس احساس نے ان کے دلوں کے دروازے کھول دیے اور وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے چلے گئے۔ عملی دعوت و شہادت سے مدنی دور کی پوری تاریخ بھری ہوئی ہے۔ ہم یہاں صرف چند واقعات نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں

(۱) غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک

بدر کی لڑائی سب سے پہلی باضابطہ جنگ تھی جو موحدوں اور مشرکوں کے درمیان برپا ہوئی اور یہ سب سے پہلا موقع تھا جب اس اصولی جنگ کا نمونہ پیش کیا گیا جس کی تعلیم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ جاہلیت عرب کی جنگ میں مقتولوں، قیدیوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ جو سنگ دلانہ اور بہیمانہ سلوک کیا جاتا تھا اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ عرب اپنے دشمنوں کے لیے بھیڑیے بن جاتے تھے جن کے دلوں میں اپنے شکار کے لیے کوئی رحم نہیں ہوتا۔ اسلام نے اس ظالمانہ سلوک کو قطعاً بند کر دیا۔ اور فاتحین کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ جن لوگوں پر انھوں نے فتح پائی ہے وہ بھی انسان ہی ہیں اس لیے ان کے ساتھ انسانیت اور شرافت کا سلوک ہونا چاہیے۔

غزوۂ بدر میں جو لوگ گرفتار کیے گئے تھے حضورؐ نے انہیں ان کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے صحابہ کے درمیان تقسیم کر دیا اور یہ ہدایت کی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ اس ہدایت پر صحابہ نے جس طرح عمل کیا اس کا حال خود ایک قیدی نے بیان کیا ہے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی ابوعزیز بن عمیر بھی قیدیوں میں تھے، ان کا بیان ہے کہ میں قبیلہ انصار کے جن لوگوں کی نگرانی میں تھا ان کا برتاؤ میرے ساتھ یہ تھا

کہ جب ان کا دن یا رات کا کھانا آتا تو وہ روٹی مجھے دیتے اور خود کھجوریں کھا کر بسر کرتے، ان میں جس شخص کے ہاتھ بھی کوئی روٹی کا ٹکڑا آتا وہ مجھے دے دیتا۔ مجھے اس پر شرم آتی اور میں ان میں سے کسی کو روٹی کا ٹکڑا واپس کرتا کہ آپ خود کھائیں لیکن وہ مجھے پھر لوٹا دیتے اور اس میں سے خود کچھ بھی نہ کھاتے۔ اور یہ عزیز بن عمیر وہ شخص تھے جو نضر بن حارث کے بعد غزوۂ بدر میں مشرکین کے صاحبِ لوا یعنی علم بردار تھے۔ (ابن ہشام)

کھلی بات ہے کہ جب انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی شدید دشمنی اور اس کے بعد اپنے ساتھ اس حسنِ سلوک کو دیکھا ہوگا تو ان پر کتنا اثر پڑا ہوگا۔

قید کی پہلی شب میں صحابہ نے نگرانی اور احتیاط کی وجہ سے قیدیوں کو کچھ سختی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ قیدی بے چین تھے اور ان میں سے بعض رونے لگے، ان کے رونے کی آواز سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اتنے بے چین ہوئے کہ رات بھر سو نہ سکے۔ صحابہ کو معلوم ہوا تو ان میں سے بعض نے حضرت عباسؓ کی بندش ڈھیلی کر دی۔ حضورؐ کو خبر ملی تو آپ نے حکم دیا کہ تمام قیدیوں کی بندشیں ڈھیلی کر دی جائیں۔ کیا ان قیدیوں پر حضورؐ کی اس شفقت اور مساوات کا اثر نہ پڑا ہوگا؟

اللہ کے نیکوکار بندوں کی مدح کرتے ہوئے سورۃ الدھر (آیت: ۸، ۹) میں کہا گیا ہے:

> ”وہ خود کھانے کی خواہش اور ضرورت کے باوجود اپنا کھانا مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم تمہیں محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلا رہے ہیں۔
> ہم نہ تم سے اس کا کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ یہ خواہش ہے کہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو۔“

(۲) ایک مسلمان قیدی

قید و بند، مصائب اور سزائے قتل کے موقع پر مسلمانوں نے اپنے ایمان و یقین، استقامت علی الحق، محبت رسول اور اپنے حسنِ اخلاق کے جو عملی نمونے پیش کیے اس نے بھی اسلامی دعوت کی اشاعت میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کی ایک بڑی موثر اور دل کش مثال حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی قید اور ان کی شہادت کا واقعہ ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دس صحابیوں کی جماعت ایک مہم پر بھیجی۔ راستے میں قبیلہ بنو لحیان کے دو سو تیر اندازوں نے انہیں گھیر لیا۔ اس جماعت کے بیشتر افراد کفار سے لڑ کر شہید ہو گئے۔ حضرت خبیبؓ کو ان لوگوں نے دھوکے سے گرفتار کیا اور مکہ لے جا کر انہیں بنو حارث کے

ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس خاندان کے ایک شخص حارث بن عامر کو انھوں نے غزوۂ بدر میں قتل کیا تھا۔ بنو حارث نے ان سے انتقام لینے کے لیے ان کو خرید لیا۔ ایک مدت تک وہ بنو حارث کی قید میں رہے۔ بنت الحارث (اس کا نام زینب تھا) کا بیان ہے کہ جب بنو حارث نے خبیبؓ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو انھوں نے اس سے استرہ مانگا تا کہ قتل سے پہلے اسے استعمال کر کے صفائی حاصل کر لیں۔ بنت الحارث نے عاریتاً انہیں استرہ دے دیا۔ اس کا بیان ہے کہ غفلت میں میرا ایک چھوٹا بچہ ان کے پاس چلا گیا۔ جب میں چونکی تو میں نے دیکھا کہ وہ اسے اپنے زانو پر بٹھائے ہوئے ہیں اور استرہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دیکھ کر میں سخت گھبرائی۔ میرا اضطراب انھوں نے محسوس کر لیا اور کہا، کیا تو ڈرتی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا؟ میں ہرگز اسے قتل نہیں کروں گا۔ بنت الحارث کا بیان ہے، واللہ میں نے کسی قیدی کو خبیب سے بہتر نہیں دیکھا۔ بخدا میں نے ایک دن ان کے ہاتھ میں انگوروں کا گچھا دیکھا جس سے وہ انگور کھا رہے تھے حالانکہ ان کے پاؤں میں بیڑی تھی اور اس وقت مکے میں کوئی پھل موجود نہ تھا۔ وہ کہتی ہیں یقیناً وہ اللہ کا بھیجا ہوا رزق تھا جو اس نے خبیب کو عطا کیا تھا۔ جب وہ خبیبؓ کو قتل کرنے کے لیے حدود حرم سے نکال کر (بمقام تنعیم) لے گئے تو انھوں نے کہا مجھے اجازت دو کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں، کافروں نے انہیں اس کا موقع دے دیا۔ انھوں نے دو رکعتیں پڑھیں اور کہا اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم مجھے خوف زدہ سمجھو گے تو میں ان دو رکعتوں کو اطمینان سے طویل کر کے ادا کرتا۔ پھر انھوں نے دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

> ''میں جب قتل کے وقت مسلم ہوں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو پر گرایا جاتا ہوں۔ میں خدا کی راہ میں قتل کیا جا رہا ہوں۔ اگر وہ چاہے تو میرے کٹے ہوئے اعضاء کے جوڑ جوڑ کو بابرکت بنا دے۔''

اس کے بعد عقبہ بن الحارث نے انہیں قتل کر دیا۔ خبیب ہی تھے جنھوں نے ہر مسلم کے لیے جب وہ قید کر کے قتل کیا جائے، دو رکعتوں کی سنت جاری کی۔ (بخاری شریف، کتاب المغازی) بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ قتل کے وقت بعض شریروں نے ان سے کہا۔ کہو خبیب تم اس وقت چاہتے ہو گے کہ تمہاری جگہ یہاں محمد ہوتے۔ انہوں نے جواب دیا۔ بخدا میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ رسول خداؐ کے قدم مبارک میں کوئی کانٹا چبھے۔

ایسے ہوتے تھے اس وقت کے مسلمان قیدی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بعد کو بنو حارث کا

خاندان بھی مسلمان ہو گیا۔ حضرت خبیبؓ کے اخلاق و کردار اور ان کے زندہ ایمان نے بنو حارث کے خاندان کو یقیناً متاثر کیا ہوگا اور ان کے دلوں میں اسلام کی محبت اسی وقت پیدا ہو چکی ہوگی۔

(۳) سردارِ قوم مسلمان ہو گیا

حضورؐ نے نجد کی طرف ایک جماعت روانہ کی وہ لوگ بنو حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال حنفی کو گرفتار کر کے لے آئے۔ حضورؐ نے ان کو مسجد کے ستون سے بندھوا دیا۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس ستون کے پاس تشریف لے گئے تو پوچھا: ثمامہ کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا اے محمد اگر مجھے قتل کرو تو ایک ایسے شخص کو قتل کرو گے جو اس کا مستحق ہے اور اگر چھوڑ دو تو ایک شکر گزار کو آزاد کرو گے اور اگر مال چاہتے ہو تو بتاؤ، دیا جائے گا۔ دوسرے دن بھی یہی سوال جواب ہوا۔ تیسرے دن اس سوال جواب کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ انہیں آزاد کر دیا جائے۔ وہ چھوٹ کر قریب کے ایک نخلستان میں گئے اور وہاں جا کر غسل کیا۔ اس کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد رسول الله۔ مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے کہا۔ خدا کی قسم آپ کے چہرے سے زیادہ مجھے کس چہرے سے نفرت نہ تھی۔ لیکن آج آپ کے چہرے سے زیادہ مجھے کوئی چہرا محبوب نہیں۔ آپ کے دین سے زیادہ مجھے کوئی دین مبغوض نہ تھا۔ لیکن آج آپ کے دین سے زیادہ مجھے کوئی دین محبوب نہیں۔ آپ کے شہر سے زیادہ مجھے کوئی شہر مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے شہر سے زیادہ کوئی شہر مجھے محبوب نہیں۔ پھر انھوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! میں عمرے کے لیے جا رہا تھا کہ گرفتار ہو گیا اب آپ اجازت دیں تو میں عمرہ کر لوں۔ آپ نے انہیں بشارت بھی دی اور عمرہ کی اجازت بھی۔ جب یہ مکہ گئے تو قریش نے کہا۔ ثمامہ کیا تم صابی یعنی بے دین ہو گئے؟ انھوں نے کہا میں بے دین نہیں بلکہ مسلمان ہو گیا ہوں اور اے اہل مکہ! اب تمھیں غلے کا ایک دانہ نہیں مل سکتا جب تک رسول اللہ اجازت نہ دیں، مکے میں غلہ یمامہ سے آیا کرتا تھا۔ جب وہ یمامہ پہنچے تو غلہ رکوا دیا۔ آخر قریش نے حضورؐ کو قرابت کا واسطہ دے کر سفارش بھجوائی تو غلہ پھر آنے لگا۔ (جمع الفوائد بحوالہ بخاری و مسلم)

تین دن کی قید میں ثمامہ نے دیکھ لیا کہ مسلمان کیسے ہوتے ہیں، ان کی زندگی کے شب و روز کیا ہیں اور یہ جس دین کی دعوت دے رہے ہیں وہ کیا ہے؟ ان کی مخالفت کسی ذاتی عناد کی وجہ سے نہ تھی بلکہ غلط فہمی کی وجہ سے تھی جب وہ دور ہو گئی تو مسلمان ہو گئے۔ حضورؐ نے ان کو براہ راست

اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی نہیں دی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اسلام لانا سراسر حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں کے اعمال و افعال کے مشاہدے کا ثمرہ تھا۔

رسول اللہ کی محبت واطاعت

غیر مسلموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا ایک بڑا عنصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی محبت تھی جس سے وہ سرشار تھے اور اطاعت تھی جس کی مثال سے پوری تاریخ انسانی خالی ہے۔ محبت بے لوث اور اطاعت مخلصانہ۔ اس بے لوث محبت اور مخلصانہ اطاعت کو دیکھ کر ہر غیر مسلم یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہوگا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں محبت کی ایسی گرمی اور اطاعت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ میں صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کروں گا۔

(۱) عروۃ بن مسعود الثقفی جب صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ سے گفتگو کرنے آئے اور انھوں نے صحابہ کرامؓ کی محبت واطاعت اور تعظیم و اکرام رسول کے حیرت انگیز مناظر دیکھے تو مکہ جا کر انھوں نے قریش سے کہا اے گروہ قریش! میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں اور ان کے آداب بھی دیکھے ہیں مگر بخدا میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے درباری اس کی ایسی تعظیم کرتے ہوں جیسی محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی کرتے ہیں۔ کوئی بات محمدؐ کی زبان سے نکلتی ہے تو سب اس کی تعمیل کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ محمدؐ سے گفتگو کرتے ہیں تو پست آواز سے، تعظیم و اکرام کی وجہ سے نظر نہیں ملاتے۔ ان کے وضو کا جو پانی بچتا ہے اسے لینے کے لیے اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے ایک دوسرے سے لڑ جائیں گے۔ (زاد المعاد)

(۲) مدینہ اجنبی شہر بن گیا

غزوۂ تبوک میں تین جلیل القدر صحابہ غفلت کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے تھے۔ ہلال بن امیہ، مرارہ بن الربیع اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم۔ اس کوتاہی کی جو سزا انہیں دی گئی اور اس سلسلے میں جو واقعات پیش آئے وہ اس معاشرے کا آئینہ ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے بنا تھا۔ حضرت کعبؓ نے بڑی تفصیل سے اسے بیان کیا ہے اور اس قدر موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ اسے پڑھ کر آنکھیں نم ہوئے بغیر رہتیں۔ سورۂ توبہ آیت ۱۱۸ کے تحت

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ، نے اپنی تفسیروں میں اس طویل حدیث کے ایسے ترجمے کیے ہیں جس میں اصل متن کی اثر انگیزی بھی منتقل ہو گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے نہ صرف عام باشندگان مدینہ بلکہ حضرت کعبؓ کے اہل خاندان کا رخ بھی ایسا بدل گیا تھا کہ حیرت ہوتی ہے۔ مختصر طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ دو چار دن نہیں بلکہ پچاس دنوں تک حضرت کعبؓ کے لیے مدینہ ایک اجنبی شہر بن گیا تھا۔ اس کا پورا عکس سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۸ میں بھی موجود ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

> ”اور ان تینوں کو بھی اللہ نے معاف کر دیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انھوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“

یہ مقالہ ایک مختصر خاکہ ہے ان دعوتی کاموں کا جو مدنی دور میں انجام دیے گئے۔ ان کاموں کو ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اسلام کی دعوت زبان سے، قلم سے اور عمل سے۔

اس مختصر خاکے میں جو کچھ پیش کیا جاسکا ہے اس سے دعوتی کام کرنے والوں کے لیے چند سبق ملتے ہیں:

(۱) ہندستان میں غیر مسلموں کی ایک بہت بڑی تعداد چند کتابوں کو اپنی مذہبی اور مقدس کتابیں تسلیم کرتی ہے۔ ان کتابوں میں توحید کے واضح اشارات موجود ہیں اس لیے ان تک دعوت پہنچانے میں ہمیں وہ انداز اختیار کرنا چاہیے جو اہل کتاب تک اسلام کی دعوت پہنچانے میں اختیار کیا گیا ہے۔

کیونکہ انھوں نے بھی عقیدۂ توحید میں خرابی آجانے کی وجہ سے اپنے پروہتوں، برہمنوں، اپنے رشیوں اور منیوں کو فی الواقع ارباباً من دون اللہ کی حیثیت دے رکھی ہے اور پھر ہم عقیدۂ توحید کے لوازم اور تقاضے بتدریج ان کے سامنے پیش کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت زبان اور قلم دونوں ہی سے دی جانی چاہیے۔

(۲) غیر مسلموں میں دعوتی کام کرنے والوں کو وفود کی شکل میں بھی دعوت پہنچانے کا کوئی عملی منصوبہ بنانا چاہیے۔

(۳) ایسی تدابیر پر غور کرنا چاہیے کہ غیر مسلم ہمارے قریب آکر یہ دیکھیں اور سمجھیں کہ اسلام کی دعوت دینے والے خود اس پر کس طرح عمل کرتے ہیں۔

(۴) ہمیں مخلصانہ سمع وطاعت کا ایسا نمونہ پیش کرنا چاہیے جو دوسروں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا کرے کہ اس کا محرک کیا ہے؟ جب تک ہم خود سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں بنتے دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتے۔

(۵) قید وبند اور مشکلات ومصائب میں، ہمیں صبر، حسن اخلاق اور استقامت علی الحق کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا چاہیے۔

(ماہنامہ زندگی رام پور، ستمبر ۱۹۷۱ء)

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اس وقت دنیا میں انسانوں کی جو عظیم تعداد پائی جاتی ہے اس کو مابعد الطبیعی عقیدے کے لحاظ سے اصلاً دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک گروہ تو وہ ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے خدا کو مانتا ہے اور دوسرا وہ جو بالکلیہ منکر خدا ہے، اقرار خدا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور سے پہلے کسی ایسے انسانی گروہ کا پتہ نہیں چلتا جو اجتماعی طور پر منکر خدا رہا ہو یہ صرف اس دور کی خصوصیت ہے کہ خدا کا صرف انکار ہی نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اس کو ایک تحریک بنا کر تمام دنیا میں پھیلانے کی سعی بھی کی جا رہی ہے۔ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں ان کے مختلف و متضاد تصور خدا سے قطع نظر کر کے بھی دیکھیے تو وہ دو حصوں میں بٹے ہوئے نظر آئیں گے۔ان میں کا ایک گروہ تو خدا کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی حد تک آخرت کا تصور بھی رکھتا ہے اور دوسرا گروہ خدا کو تو مانتا ہے لیکن آخرت کا منکر ہے، اس کے نزدیک یہی دنیا جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ سب کچھ ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس طرح اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں تین طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو خدا اور آخرت دونوں کو تسلیم کرتے ہیں، دوسرے وہ جو خدا کا اقرار اور آخرت کا انکار کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو خدا اور آخرت دونوں ہی کے منکر ہیں۔ان تینوں کے تصورات و افکار، جذبات و میلانات اور افعال و اعمال ایک دوسرے سے الگ ہیں۔
انسان کے افکار و اعمال پر سب سے زیادہ اس کے مابعد الطبیعی عقیدے کا اثر پڑتا ہے اسی کی بنیاد پر وہ اپنی زندگی کا راستہ متعین کرتا اور اسی کی بنیاد پر وہ اپنی سرگرمیوں کا محور مقرر کرتا ہے۔ اگر وہ اس کائنات ہست و بود کو محض مادے کی پیداوار و تماشا گاہ اور بنی نوع انسان کے لیے ایک لمبی چوڑی چراگاہ تصور کرتا ہو تو اس کے اعمال و افکار کچھ اور ہوں گے۔ اور اگر وہ اس دنیائے رنگ و بو

کو ایک ذی شعور با اختیار ہستی کی صفت خلق و امر کا مظہر سمجھتا ہو تو اس کے خیالات و افعال کچھ مختلف ہوں گے۔ اور اگر وہ اس عالم سرد وگرم کو ایک مقتدر اعلیٰ کی مخلوق ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو اس کے سامنے جواب دہ بھی سمجھتا ہو تو اس کی زندگی کے کارنامے ایک الگ شان رکھتے ہوں گے۔

یہ جو کچھ لکھا گیا اس کی صحت پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے بچشم سر اس دنیا میں دیکھا جاسکتا ہے اور دیکھا جارہا ہے، یہ بھانت بھانت کی بولیاں رنگ برنگ کھیل، زندگی کے نوع بنوع نظریوں کی ریل پیل، طرح طرح کے تماشے اور قسم قسم کی سرگرمیاں جو اس جولان گاہ حیات کو پامال کررہی ہیں وہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ انسان وحدت فکر عمل سے عاری اور رہ گزار حیات میں سرگرداں و پریشان ہے، مختلف قوموں، ملکوں، نسلوں اور طبقوں کی یہ کشمکش جس نے دنیا کو نمونہ دوزخ بنادیا ہے اس بات کا اعلان ہے کہ بنی نوع انسان نے کوئی ایسی چیز گم کردی ہے جو اس کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ ضروری تھی۔

انسان کیا چاہتا ہے؟

ہم اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کہ ان مختلف گروہوں کے افکار و اعمال کیا ہیں، ہمارے سامنے اس وقت یہ سوال ہے کہ آیا کوئی ایسی خواہش اور کوئی ایسا مقصد موجود ہے یا نہیں جسے تمام انسانی گروہوں کی مشترک خواہش اور مشترک مقصد کہا جاسکے؟ دنیا میں اس وقت جو تحریکیں چل رہی ہیں اور ذی علم و ذہین افراد انسانی نے ہمارے سامنے جو کچھ پیش کیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جاسکتا ہے۔ ان مختلف گروہوں کے افکار و اعمال چاہے جو کچھ بھی ہوں کہتے سب یہی ہیں کہ ہم اس دنیا میں امن، چین، سکون اور آرام چاہتے ہیں۔ سب کی یہ مشترک خواہش ہے کہ یہ دنیا گہوارۂ امن وسلام ہو، سب کا یہ مشترک مقصد ہے کہ یہ خون چکاں کشمکش، یہ بہیمانہ قتل و غارت اور یہ ظالمانہ جبر و استبداد ختم ہو، کم سے کم دنیاوی زندگی کی حد تک تو اس مقصد میں وہ گروہ بھی شریک ہے، جو خدا اور آخرت دونوں کا منکر ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جو خدا کو بھی مانتے ہیں اور آخرت کا تصور بھی جن کے دماغوں میں موجود ہے ان کے مقصد میں اتنا اضافہ اور کیجئے کہ وہ مرنے کے بعد بھی امن، چین، سکون اور آرام کے خواہش مند ہیں، جہاں تک میرا مطالعہ ہے انسانوں کی کوئی ایسی جماعت جسے انسانی جماعت کہا جاسکے موجود نہیں ہے جس کی یہ خواہش نہ ہو اور جس کے سامنے یہ مقصد نہ ہو، اب یہیں سے یہ سوال ابھر کر

سامنے آتا ہے کہ یہ خواہش اور مقصد حاصل کیسے ہو؟ وہ کون سا قانون ہو جس سے یہ مقصد پورا ہو جائے اور وہ کون سے لوگ ہیں جن کی پیروی و اتباع سے یہ خواہش بروے کار آئے، کسی ملک کے لیے یہ صورت تو ممکن نہیں کہ ہر شخص قانون ساز بن جائے اور اپنے ہی قانون پر سب کو چلانے کی کوشش شروع کر دے متمدن ملک کو تو چھوڑ دیئے کسی جنگلی آبادی میں بھی یہ ممکن نہیں اس لیے کسی نہ کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے کسی مجموعے کو تو یہ حق دینا ہی پڑے گا کہ قانون وہ بنائے اور دوسرے لوگ اس کو مانیں اور پیروی کریں، قانون ساز مطاع اور مقتدا افراد بہت تھوڑے ہوتے ہیں انسانوں کا یہ انبوہ کثیر کسی نہ کسی کے پیچھے چلتا رہا ہے، چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اس مسئلہ پر ذرا اور گہری نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اتباع اور پیروی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ جن افراد انسانی نے ہزاروں لاکھوں کو اپنے پیچھے چلایا ہے اور ہزاروں سے اپنی اطاعت کرائی ہے وہ بھی حقیقت میں خود کسی کے مطیع و فرماں بردار رہے ہیں چاہے یہ فرماں برداری و اطاعت خود اپنے ہوائے نفس ہی کی کیوں نہ رہی ہو۔ جب انسان کی انانیت، انا و لا غیری کا نعرہ مارنے لگتی ہے تو اس کا نفس اس کا معبود و مطاع بن جاتا ہے اور وہ بڑی عاجزی و فروتنی کے ساتھ اپنے نفس کی اطاعت و عبادت میں لگ جاتا ہے، حق و باطل کا امتیاز، اچھے برے کی تمیز، سود و زیاں کا خیال اور دوسروں کی حق رسی و حق تلفی کا تصور غرض کوئی چیز اسے خواہش نفس کی اطاعت سے روک نہیں سکتی، نفس اس کا خدا ہوتا ہے اور وہ بندۂ نفس اپنے ہوائے نفس کے زیر حکم اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے قوانین بناتا ہے، قاعدے وضع کرتا ہے، کلیات و جزئیات مرتب کرتا ہے اور لاکھوں انسانوں کو ان سب کی پابندی پر مجبور کرتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بڑا مطاع و مقتدا ہے حالانکہ فی الحقیقت وہ بہت ہی ادنیٰ درجے کا مطیع و مقتدی ہوتا ہے۔

سوال یہ تھا کہ وہ کون سا قانون اور کون سے لوگ ہو سکتے ہیں جن کی پیروی و اتباع مقصد امن و سلام تک پہنچا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ کا ایک مختصر جائزہ لیجیے۔

مختلف طبقات انسانی کا مختصر جائزہ

دنیا کے اسٹیج پر سیکڑوں ہزاروں افراد نمایاں ہیں جنھوں نے اپنی اپنی زندگیاں دوسرے انسانوں کے لیے اسوہ و نمونہ کے طور پر پیش کی ہیں۔ ایک طرف عظیم الشان شاہان عالم کے پر شکوہ دربار ہیں، ایک طرف بڑے بڑے ماہر جنگ سپہ سالاروں کے آراستہ فوجی پرے ہیں،

ایک طرف دنیا کو فتح کرنے والے بہادروں کی مسلح صفیں ہیں، ایک طرف عالی دماغ حکماء اور فلاسفروں کا سنجیدہ گروہ ہے، ایک طرف آتش بیان شعرا کی بزم رنگیں ہے، ایک طرف قارون صفت دولت مندوں کے خزانے اور سیم وزر کے انبار ہیں، ایک طرف شیطان خصلت سیاست دانوں کے سیاسی جوڑ توڑ ہیں، ان میں سے ہر ایک کی زندگی اولادِ آدم کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کارتھیج کا ہنیبال، مقدونیہ کا سکندر، ایران کا دارا، روم کا سیزر، صحرائے گوبی کا چنگیز، یورپ کا نپولین، ان میں کے ہر ایک کا کارنامۂ حیات اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔

سقراط، افلاطون، ارسطو، دیوجانس اور یونان کے دوسرے فلسفیوں سے لے کر اسپنسر تک تمام حکما اور فلاسفروں کی زندگیوں میں ایک خاص رنگ نمایاں ہے، یونان کے ہومر اور عرب کے امرئ القیس، مہلہل، طرفہ، عنترہ، اور عمرو بن کلثوم کی شعلہ نوائیاں ایک الگ تاثیر رکھتی ہیں، مصر کے فرعون و قارون، بابل کے نمرود اور مکہ کے ابوجہل و ابولہب کے طور طریقے اور ان کی زندگیوں کے کارنامے اپنا ایک مخصوص رنگ رکھتے ہیں۔ کچھ انھیں پر موقوف نہیں تاریخ کے صفحات میں سیکڑوں اشخاص کی زندگیاں نمایاں ہیں جو آدم کے بیٹوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں لیکن کوئی بتائے کہ ان مختلف اصناف انسانی میں سے کسی کی زندگی بنی نوع انسان کو اس مقصد تک پہنچا سکتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یہ جن کا ذکر اوپر آیا ہے ان میں بڑے بڑے فاتح، بادشاہ اور سپہ سالار بھی ہیں جنھوں نے اپنی تلوار کی نوک سے زمین کے طبقے الٹ دیے ہیں، جن کے نیزوں اور برچھیوں نے ہزاروں کے سینے چھید ڈالے ہیں، جن کی شمشیر براں کی دھار نے لاکھوں کے رشتۂ حیات کاٹ ڈالے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کی تلوار کی کاٹ میدان جنگ سے بھی آگے بڑھی ہے، کیا اس نے انسانی اوہام کا کوئی دھاگہ بھی کاٹا ہے، کیا ان مردمیداں فاتحوں نے انسان کے دلوں کو بھی فتح کیا ہے، کیا انھوں نے انسانی ہدایت کے لیے اپنے پیچھے کوئی نمونہ چھوڑا ہے؟ کیا انھوں نے انسان کی روح کے لیے تسکین کا کوئی سامان مہیا کیا ہے؟ بلکہ کیا انھوں نے خود اپنے ملکوں اور دوسرے مفتوحہ ملکوں میں امن، چین اور سکون کی فضا پیدا کی ہے؟ کیا ان کی جنگی قابلیت ان کی بہادری اور ان کی اولوالعزمی فلاح انسانیت کے لیے کوئی کام کر سکی ہے۔ ان سوالات کے جواب آپ کو تاریخ کے صفحات دیں گے۔ قرطاجنہ (کارتھیج) کا ہنیبال آندھی کی طرح اٹھا اور اسپین

پر چھا گیا، روما کی عظیم الشان قوت بھی اس کے عزم وارادے میں حائل نہ ہوسکی، بعض یورپین مورخین کا خیال ہے کہ فن سپہ گری میں تاریخ یورپ اس کا کوئی ہم سر پیش نہ کرسکی، سکندر اعظم، جولیس سیزر اور نپولین بھی اس فن میں اس سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

اے، جے گرانٹ لکھتا ہے کہ ۲۱۸ سے ۲۰۵ ق م تک ہنی بال اطالیہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوچ کرتا رہا اور کوئی اس کا مزاحم نہ ہوا، اس نے رومیوں کو فاش شکستیں دیں اور اگر وہ اپنی حماقت سے خاص روما پر حملہ کرنے میں لیت ولعل نہ کرتا تو تاریخ اسے فاتح روما کے نام سے بھی یاد کرتی، یہ سب کچھ تھا لیکن کیا ہنی بال یہ جنگیں انسانیت کی فلاح کے لیے لڑ رہا تھا؟ تاریخ کہتی ہے نہیں بلکہ صرف حدود مملکت بڑھانے اور اپنی قوت واقتدار کا سکہ جمانے کے لیے۔ ہنی بال کو قوم خود کارتھیج پر حملہ آور کی حیثیت رکھتی تھی اور اس نے وہاں کے اصل باشندوں سے کبھی اچھا سلوک نہیں کیا، کارتھیج کے افریقی ہمیشہ ان لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دل سے ان جنگوں کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ امن وامان کے خواہاں اور اپنے لیے انسانیت ومساوات کے طلب گار تھے۔ ہنی بال کے زوال میں اس کی خودسری وخودرائی کے ساتھ باشندگان قرطاجنہ کی نفرت کو بھی خاصہ دخل ہے، وہ ان جنگوں سے اس قدر بیزار تھے کہ انھوں نے ہنی بال کو تازہ کمک بھیجنی بند کردی اور اس کا زوال شروع ہوگیا آخر وہ ہنی بال کی مدد کیوں کرتے؟ کیا اس لیے کہ اس کی قوت بڑھتی جائے اور خود ان پر اس کا پنجہ استبداد مضبوط ہوتا جائے؟ ہنی بال کی اس فتح وکامرانی اور اس کی تمام جنگی قابلیتوں کا حشر یہ ہوا کہ خود کارتھیج میں اسے رومیوں سے شکست فاش کھانی پڑی اور وہاں سے فرار ہوکر شام میں پناہ لینی پڑی اور اس کی اولوالعزمی کا یہ کتنا عبرت ناک انجام ہے کہ آخر کار اسے زہر کھا کر خودکشی کرنی پڑی، وہ مرد میدان جس نے کارتھیج سے لے کر اسپین تک کی سرزمین کو ہلا دیا تھا بزدلی کی موت مر گیا۔ وہ نہ اپنے ملک کو امن، چین اور سکون بخش سکا اور نہ کسی دوسرے ملک کو، یہاں تک کہ خود اس کی اپنی زندگی بے چینی اور بے اطمینانی کی نذر ہوگئی۔

روم کے جولیس سیزر کا عروج جس زمانے میں ہوا وہ جمہوریت وشاہیت کی کشمکش کا زمانہ تھا، روم کے کتنے ہی مشاہیر سینٹ کی ڈکٹیٹر شپ سے نالاں اور جمہوریت عوام کے خواہاں تھے، جولیس سیزر بھی ابتدا میں اپنے آپ کو اسی خیال کا حامی ظاہر کرتا تھا لیکن درحقیقت وہ سینٹ کی شاہیت کو توڑ کر خود اپنی شہنشاہیت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جب اپنی بہادری اور فوجی

قابلیت سے ملک میں مقبولیت حاصل کر لی اور فوج پر اپنا اثر جمالیا تو اپنے مقصد کے حصول کی تدبیریں کرنے لگا، اس نے سینٹ کے دو اور ذی اثر مخالفین سے اس کام کے لیے ساز باز بھی کیا اور اپنی ذہانت، بہادری اور جنگی مہارت کی وجہ سے ترقی کے منازل طے کرتا رہا۔ تین بڑے اشخاص میں جو اتحاد ہوا تھا اس کی بنا چونکہ خود غرضی اور ذاتی مصلحت پر رکھی گئی تھی اس لیے یہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا، سیزر کا ستارہ اقبال چمک رہا تھا اس لیے وہ اپنی راہ کے تمام روڑے ہٹا کر بلاشرکت غیرے روم پر قابض ہو گیا، وہ اپنے آپ کو جمہور کا ہمدرد ظاہر کرتا تھا اور اس نے اپنی ترقی کی راہ میں جمہور روم کی اخلاقی ہمدردی سے کافی مدد بھی حاصل کی لیکن جب یہ روم پر قابض ہوا تو اس نے جمہوریت کے خیالات بالائے طاق رکھ دیئے اور بچی کھچی جمہوریت کو بھی ختم کر کے مطلق العنان شہنشاہ بن گیا۔ اے، جے گرانٹ اس کے بارے میں لکھتا ہے:

"سیزر ہی پہلا شخص تھا جس کی اولوالعزمی سے ایک فرد واحد کے ہاتھ میں سلطنت روما کی عنان حکومت آگئی اور اس کے جبر وسطوت اور عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے شہنشاہی روما کا آئندہ چل کر قیام عمل میں آیا .... سیزر شہنشاہی کے درجے تک جمہور کا حامی بن کر پہنچا تھا۔"

اس جمہور کے حامی نے جب سلطنت حاصل کر لی تو انتظام سلطنت کی سب سے پہلی دفعہ جو بنائی وہ یہ تھی کہ تمام اقتدار ایک ہی شخص کے قبضے میں رہے، جمہور کے ساتھ جولیس سیزر کی اس غداری کا انجام یہ ہوا کہ جمہوریت عوام کے خواہاں اس کے خلاف ہو گئے، کچھ دوسرے ایسے بڑے لوگ بھی اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے جو اس کی شہنشاہی کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ مارچ ۴۴ ق م میں سیزر کے مخالفین نے اس کا کام تمام کر دیا۔ سسرو نے جو روما کا سب سے بڑا زبان آور مقرر اور جمہوریت عوام کا زبردست حامی تھا سیزر کی موت پر یہ فقرہ کہا تھا: "جابر کا تو خاتمہ ہو گیا مگر نفس جبر ابھی زندہ ہے۔"

یہ تھا جولیس سیزر اور اس کا انجام، کیا ایسے جابر، غدار اور مطلق العنان شخص کو فلاح انسانیت کے لیے نمونہ بنایا جا سکتا ہے اور اگر اس کی پیروی کی جائے تو امن، چین اور سکون حاصل ہو سکتا ہے؟ موٹی عقل بھی اس کا جواب نفی میں دے گی، چنگیز کو چھوڑیے جس کی چنگیزی کسی تبصرے کی بھی محتاج نہیں ہے۔

اب آیئے ذرا نپولین کو دیکھ لیجیے، ماضی قریب میں جس کے غلغلے سے یورپ وافریقہ

گونج اٹھا تھا۔

انقلاب فرانس کی ہنگامہ خیزیوں میں جبکہ عوام شاہیت کے خلاف بغاوت کر رہے تھے نپولین کو اپنی ذہانت، تدبر، بہادری اور فوجی صلاحیت کی وجہ سے ترقی کا موقع مل گیا، اس نے بھی جولیس سیزر کی طرح اپنے آپ کو عوام کا خیر خواہ اور جمہوریت کا حامی ظاہر کر کے پبلک کی اخلاقی مدد حاصل کی، ایک طرف عوام میں مقبولیت اور دوسری طرف لڑائیوں میں فتح یابی یہ دو چیزیں ایسی تھیں جس نے اس کو آناً فاناً فرانس کا بڑا آدمی بنا دیا۔ اول یوم سے اس کی نیت یہ تھی کہ ملک کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن عوام اس کو بہت نیک اور جمہوریت پسند سمجھتے تھے، اٹلی میں جو فتوحات اس نے حاصل کیں اس نے اسے پورے ملک کا محبوب بنا دیا اور جب یہ اٹلی سے فتح یاب واپس آیا تو اس نے ملک پر اقتدار حاصل کرنے کی تدابیر شروع کر دیں۔ اے۔ جے گرانٹ لکھتا ہے:

"نپولین کی ہوس پہلے ہی سے کامل اختیارات حاصل کر لینے کی تھی۔ پیرس پہنچ کر اس نے مختلف سیاست دانوں سے ساز باز شروع کر دی، سیئس نامی ایک شخص خاص طور پر اس کے کام کا معلوم ہوا یہ شخص انقلاب کے ابتدا میں بحیثیت ایک سیاسی نظریہ ساز کے خاص طور پر مشہور ہو چکا تھا اس کے تمام خیالات کی موافقت کیے بغیر نپولین اس کا شریک ہو گیا یہ توقع کی جاتی تھی کہ نپولین اس قدر ہر دل عزیز ہو چکا تھا کہ بغیر کشت و خون و جبر و تعدی کے وہ ایسے تغیرات کر سکتا تھا جس سے اس کو اور اس کے ہمراہیوں کو قوت و اقتدار حاصل ہو سکے، پیرس کے متعینہ سپاہی اس کی ماتحتی میں دے دیے گئے اور مجالس وضع قوانین چند میلوں کے فاصلے پر بمقام سین کلو منتقل کر دی گئیں۔"

(تاریخ یورپ اے، جے گرانٹ ترجمہ حمید احمد انصاری بی اے)

یہ توقع پوری نہ ہوئی اور نپولین کو اقتدار حاصل کرنے کے لیے جبر و تعدی کرنی ہی پڑی۔ اپنے اوپر فرضی حملہ کرا کے مخالفین کو کچلنے کی تدبیر اس زمانے کی نئی ٹکنک سمجھی جاتی ہے، مصر کے جمال عبدالناصر نے جب یہ کھیل کھیلا تھا اور اپنے اوپر فرضی حملے کے بہانے سے اخوان المسلمین پر ہاتھ اٹھایا تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ترکیب اس کے اپنے دماغ کی اپج ہے لیکن اصلاً یہ نپولین کی "عالی دماغی" کا کرشمہ ہے۔ آج سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے نپولین نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور اپنے اوپر فرضی حملہ کا عذر کر کے اس نے مجلس قانون ساز کے مخالف ارکان کو بزور منتشر کر دیا تھا اور اپنے پٹھوؤں کے ذریعہ قانون سازی کا پورا اختیار حاصل کر لیا تھا۔ اس نے سیئس سے جو ساز باز

کی تھی اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اس لیے اس نے اس شخص کو بھی اپنی راہ سے ہٹا دیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد فرانس کا مطلق العنان بادشاہ بن گیا اور اپنے اس اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے اس نے جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا تاکہ عوام اسی میں الجھے رہیں، ورنہ خوف تھا کہ کہیں پھر ان پر جمہوریت کی سنک سوار نہ ہو جائے۔ ایک جگہ اے، جے گرانٹ نے لکھا ہے:

"اگر قوت واقتدار حاصل کرنے کی لامحدود ہوس اس میں نہ ہوتی جیسا کہ اس کے سوانح سے مترشح ہے تو یقیناً وہ تہذیب وتمدن کے سب سے بڑے مصلحین میں شمار کیا جاتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ گو اس نے فرانس ویورپ میں بہت سے سودمند تغیرات کیے مگر اسی کے باعث پندرہ سال کی ایک مسلسل جنگ شروع ہو گئی۔"

انتہا یہ ہے کہ وہ جنگوں میں صلح سے اس لیے کتراتا تھا کہ صلح اور امن وامان اس کے اقتدار کے لیے مضر تھے۔ آسٹریا پر حملہ اور صلح سے نپولین کے اعراض کا حال بیان کرتے ہوئے اے، جے گرانٹ نے لکھا ہے:

"اگر صلح ہو جاتی تو فرانسیسی پھر اپنے قدیم نصب العین کی طرف رجوع ہو جاتے اور ایک حقیقی جمہوریت اور آزاد ومساویانہ دستور کے قائم کرنے کا خیال پیدا ہو جاتا۔"

ہوس اقتدار اور حدود مملکت کو وسیع سے وسیع تر کر دینے کے خبط نے نپولین کو لامحدود جنگوں میں پھنسا دیا تھا۔ ایک طرف یورپ کے کئی ایک ملک توازن قوت کے درہم وبرہم ہو جانے کی وجہ سے نپولین سے برہم تھے اور دوسری طرف خود فرانس میں بہتیرے جاں باز وسرفروش سپاہی اس کے غرور سلطنت اور ہوس اقتدار سے ناداں تھے اس کا انجام یہ ہوا کہ اندرون ملک اس کو ختم کرنے کی سازشیں شروع ہو گئیں اور بیرون ملک اس کے حدود اقتدار کو محدود کرنے کی تدبیریں عمل میں آنے لگیں اور اس کے آفتاب اقبال کو گہن لگنا شروع ہو گیا۔ آخر کار واٹرلو کے میدان میں اس کے غرور کا سر نیچا ہوا اور سارا اقتدار پانی کے بلبلے کی طرح بہہ گیا۔ اے، جے گرانٹ نے اس کے آخری انجام کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

"برطانوی اور پروشی افواج کے متحدہ حملوں نے فرانسیسیوں کو پراگندہ کر دیا اور ان کا شہنشاہ فرار ہو گیا وہ پیرس پہنچا اور وہاں مقابلہ کرنے کے لیے از سر نو انتظام کرنے لگا مگر سب بے سود ہوا کیونکہ سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا آخر کار وہ مستعفی ہو گیا اور برطانیہ کے رحم وکرم پر اپنے کو چھوڑ دیا اگر وہ پروشیا والوں کے ہاتھ میں پڑ جاتا تو

شاید اس کا انجام اور بھی برا ہوتا برطانیہ نے اس کو قید کر کے سینٹ ہلینا کو روانہ کر دیا جہاں وہ چند سال رہ کر ۱۸۲۱ میں فوت ہو گیا۔"

دنیا کے ان تین بڑے بڑے سپہ سالاروں اور بادشاہوں کے کارناموں کا یہ مختصر جائزہ ہمیں کیا بتاتا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ ان تینوں کو اس برے انجام تک پہنچانے میں سب سے بڑا ہاتھ ان کے غرور شاہی اور ان کے ہوس اقتدار کا تھا، یہ ہوس اقتدار سبب مشترک ہے جس نے ہر ایک کو آخر کار پچھاڑ کر چھوڑا، یہ ہوس اقتدار ہی وہ بس کی گانٹھ ہے جس نے ہمیشہ دنیا کی صاف اور ستھری فضا کو مسموم کیا ہے، اسی نے دنیا کو بے چینی، بے اطمینانی اور اضطراب و انتشار کے زہریلے پھل تحفے میں دیے ہیں، اسی نے ماضی میں بھی بڑی بڑی جنگیں برپا کی ہیں اور آج بھی مہیب جنگ کا سرخ بادل بن کر فضائے عالم پر چھا رہی ہے۔ یہ وہ نشہ ہے جسے صرف موت اور تباہی کی ترشی ہی اتار سکتی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ وہ بندہ بننے کے بجائے خدا بننے کی کوشش کرنے لگتا ہے، بندگی اس کی اصل فطرت میں داخل ہے، خدائی سے اسے دور کا لگاؤ بھی نہیں اب اگر کوئی اصل فطرت کے خلاف خدائی کے تخت پر براجمان ہونا چاہے تو اس کے نتیجے میں ایک خوں ریز کشمکش کا پیدا ہونا امر لازم ہے۔

قرطاجنہ کے ہنیبال، روم کے سیزر اور فرانس کے نپولین پر موقوف نہیں ہے، آپ دنیا کے تمام ایسے بادشاہوں اور جنرلوں کا حال پڑھیے جنھوں نے مقتدر اعلیٰ بن کر اپنے ہی جیسے انسانوں پر حکومت کرنے کی کوشش کی وہ کبھی امن، چین اور سکون سے نہ خود آشنا ہوئے اور نہ وہ بدقسمت ملک ہی اس سے آشنا ہو سکا جہاں انھوں نے اپنا تخت اقتدار بچھایا تھا۔ قرآن نے ملکہ سبا کی زبان سے شاہان عالم کی اس فطرت اور ان کی تاریخ کو کتنے مختصر اور جامع لفظ میں بیان کر دیا ہے:

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ج
(النمل: ۳۴)

"بے شک بادشاہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور اس کے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔"

فی الحقیقت وہ دنیاوی زندگی میں بھی امن، چین اور سکون پیدا نہ کر سکے اور اگر اخروی زندگی کے لحاظ سے ان کے نمونہ ہائے عمل کو دیکھا جائے تو وہ وہاں دنیاوی زندگی سے بھی زیادہ ناکام نظر آئیں گے کیونکہ ہر قسم کی بداخلاقی و بدکرداری انھیں کے درباروں سے نکل کر ہر جگہ پھیلتی رہی۔ یہ

تو کبھی کبھی ہوا کہ آبادیوں اور جلوت خانوں کے مجرموں کو ان کے رعب و دبدبہ نے روپوش ہونے پر مجبور کر دیا لیکن ویرانوں اور خلوت خانوں میں روپوش مجرموں کو وہ کبھی جرائم سے باز نہ رکھ سکے، انھوں نے ملک کے نظم و نسق کو درست کرنے کی کوششیں کیں لیکن مملکت روح کی درستی کا کوئی سامان نہ کر سکے بلکہ ان کے اخلاق و اعمال، مملکت روح کی مکمل تباہی و بربادی کے سامان بہم پہنچاتے رہے۔

دنیا کے اسٹیج پر بڑے بڑے رنگین بیان شعراء بھی نمودار ہوتے رہے ہیں لیکن خیالی دنیا کے یہ شہنشاہ عملی دنیا میں ہمیشہ فقیر بے نوا بن کر سامنے آتے ہیں، گفتار کے یہ غازی تاریخ کے کسی دور میں کردار کے غازی نہ بن سکے، ان کی شاعری نے فوری جوش و ہنگامہ اور خیالی لذت والم کی پیدائش وافزائش کے کارنامے تو انجام دیے ہیں لیکن انسانی زندگی کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے اس لیے کہ ان کی شیریں زبانیوں اور شعلہ نوائیوں کے پیچھے مضبوطی کردار اور حسن عمل کا کوئی نمونہ نہیں رہا۔

یو[نان] کے ہومر کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی ایلیڈ اور آڈیسی رزم اور بزم کی نقشہ کشی کا [شاہ]کار سمجھی جاتی ہیں لیکن ان میں انسان کی بے چین زندگی کی تسکین کے لیے کوئی مواد نہیں، اس کی [نظمیں] دوسری قوموں کے مقابلے میں یونانی قوم کی افضلیت و شرافت کی منظوم داستان کے سوا اور [کچھ نہیں]۔ عرب کے بڑے بڑے آتش بیان شعراء کے قصیدے، تہور و شجاعت کے واقعات، قبائل [کی] مدح و ثنا اور رندی و ہوس ناکی کے قصوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن انسان کی فلاح و سعادت [کے] کسی صحیح لائحہ عمل سے بالکل خالی ہیں اسی لیے قرآن نے ان کے بارے میں کہا:

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ؕ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِىْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (الشعراء: ۲۲۴-۲۲۷)

”اور شعراء کہ ان کی پیروی بہکے ہوئے لوگ کرتے ہیں، کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں اسے کرتے نہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کی زندگی بسر کی۔“

قرآن نے شعراء کی صرف مذمت پر اکتفا نہ کی بلکہ ان کی شاعری کی بے اثری کا سبب بھی بتا دیا، ان کی پریشان خیالی، انتشار فکر، ہر وادی خیال میں بھٹکنا، نری لفاظی اور ایمان و عمل صالح سے ان کی زندگیوں کا خالی ہونا، یہ ہے ان کے کلام کی بے اثری کا سبب۔ ظاہر ہے کہ ایسے

لوگوں کی پیروی وہی لوگ کریں گے جو خود رہ گزارِ حیات میں سرگشتہ و پریشان ہوں، ہاں جو شعرا ایمان و عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہیں ان کی شاعری اس مذمت سے مستثنیٰ ہے۔ ان کی شاعری سے کچھ فائدے حاصل ہوتے ہیں لیکن انسانی زندگی میں انقلاب برپا کرنے اور انسان کی اصلاحِ کلی کے لیے ان کی شاعری بھی کارآمد نہیں، دنیا کی تاریخ اس واقعہ پر خود گواہ ہے کہ آج تک کوئی شاعر اصلاحِ عالم کا عظیم الشان فریضہ انجام نہ دے سکا۔ پھر اصل سوال یہ ہے کہ جن شعرا کو ایمان و عمل صالح کی دولت ملی کیا یہ کسی شاعر کے حسنِ کلام و حسنِ عمل کا نتیجہ تھا؟ نہیں بلکہ یہ کسی اور کا عطیہ تھا!

دنیا میں بڑے بڑے حکیم اور فلاسفر بھی پیدا ہوئے ہیں، انھوں نے فلسفۂ اخلاق پر بڑی نفیس کتابیں مرتب کی ہیں، وعظ و پند کے موتی بکھیرے ہیں۔ ان کی فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں اور ان کی عقلِ رسا کی فلسفہ طرازیوں نے کبھی کبھی نظامِ عالم کے نقشے بدل دیے ہیں۔ انھوں نے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی کے لیے عجیب عجیب نظریے پیش کیے ہیں لیکن فلاحِ انسانیت کی طلسم کشائی سے ان کی دوررس عقلیں عاجز و درماندہ رہی ہیں اور جہاں تک عمل کا سوال ہے وہ نہ فرائضِ انسانی کی انجام دہی میں عملی حصہ لے سکے ہیں اور نہ انسانی نظامِ ہدایت کا کوئی عملی نقشہ مرتب کر سکے ہیں۔ ان کے تمام اخلاقی نکتہ سنجیاں عملی دنیا میں بے کار ثابت ہوئی ہیں، کیونکہ ان کے پیچھے ان کے حسنِ عمل کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ یونان کے ابوالحکما سقراط نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد رکھی اور اس کے شاگرد ارسطو نے اسے درجۂ کمال تک پہنچایا، آج دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں اس کے فلسفۂ اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اخلاقیات کے بڑے بڑے پروفیسر فصیح و بلیغ لکچر دیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ارسطو کے فلسفۂ اخلاق اور پروفیسروں کے اخلاقی لکچروں سے کتنے انسان صحیح راستے پر آئے، کتنے انسانوں کی زندگیوں میں اخلاقی انقلاب برپا ہوا اور کتنے لوگوں نے عملی طور پر اسے اختیار کیا، اس لحاظ سے دیکھیے تو نتیجہ صفر ہوگا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ جب عملی دنیا میں اخلاقیات کے پروفیسروں کی زندگی دیکھی جاتی ہے تو وہ عام انسانوں کی زندگی سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات ان کی پرائیوٹ زندگی ان کے اخلاقی لکچروں سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور انسان کی زندگی کو بدلنے کے لیے نری لفاظی کبھی مفید ثابت نہیں ہوتی۔ بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ: انسان کانوں سے نہیں آنکھوں سے بنتا ہے۔

نظری حیثیت سے بھی دیکھیے تو حکماء اور فلاسفروں کے نظریات ایک دوسرے سے اتنے مختلف اور متضاد نظر آئیں گے کہ شاید ایسا تضاد و اختلاف کسی اور جگہ نظر نہ آئے۔ مثال کے طور

پر ایک ہی استاد سقراط کے تین شاگرد ارسطو، افلاطون اور زینوفن ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ انھیں ایک منبع علم سے فیض یافتہ قرار دینا انتہائی دشوار ہے۔ ایک صاحب علم کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ کسی فلسفیانہ نظریہ پر کوئی دو فلسفی بھی کلی طور سے متفق نہیں، ان فلاسفہ کی طرف جو خیالات منسوب ہیں ان میں سے بعض کو پڑھ کر تو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے کہ اس طرح کے خیال رکھنے والے کو فلسفی کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ مثلاً بقول اے، جے گرانٹ: افلاطون کا یہ خیال تھا کہ رسم نکاح موقوف کر دی جائے اور ذکور واناث کی تعلیم ایک ہی اصول پر ہو اور مختلف پیشوں کے اختیار کرنے میں دونوں آڑے کوئی روک نہ ہو۔ اس خیال کو پڑھ کر ایسا شخص جو عورتوں اور مردوں کی تخلیق اور ان کے فطری اختلاف پر نظر رکھتا ہے افلاطون کے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔

طبقات انسانی میں سے ایک اور ''طبقہ عالیہ'' کا ذکر آخر میں مناسب ہے، یہ بڑے بڑے مقنن افراد انسانی کا طبقہ۔ دنیا میں قانون ساز انسانوں کی کمی نہیں رہی ہے، یونان، روم، ایران، مصر اور ہندوستان کے بڑے بڑے قانون سازوں کی تاریخ پڑھیے، ان کے بنائے ہوئے جو قانون محفوظ رہ گئے ہیں انھیں جانچیے اور پرکھیے آپ دیکھیں گے کہ آج تک کسی ایک انسان یا انسانوں کے کسی گروہ نے کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جو اس کے درد کا درماں ہوتا، بڑی محنت و جانفشانی سے قوانین و دستور بنائے گئے لیکن ابھی ان کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ نقائص سے پر نظر آنے لگے، وہ جس ملک کے لیے بنائے گئے وہاں بھی وہ تمام طبقات کو مطمئن نہ کر سکے اس لیے کہ وہ نفسانیت، اونچ نیچ اور ناجائز امتیازات سے خالی نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی قانون بھی سند دوام تو کیا پاتا زیادہ مدت تک چل بھی نہ سکا۔ کبھی تو ایسا ہوا کہ قانون بنانے والوں نے اپنے قانون خود بدل ڈالے اور کبھی ایسا ہوا کہ دوسرے دور کے سربراہ کاروں نے اسے حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا، حکومتیں عوام کی اصلاح کے لیے نہیں بلکہ اپنے مفاد و مصالح کے پیش نظر روز قوانین بناتی ہیں اور روز انھیں خود مٹاتی ہیں اور یہ صورت حال زمانۂ نایادگار سے آج تک قائم ہے۔ اپنی عقل سے گھڑے ہوئے قوانین کی ایک مثال پرانی تاریخ سے پیش کی جاتی ہے، یونان کا سولن (ولادت ۶۳۸ وفات ۵۵۹ ق م) جو اپنی قانون سازی میں تاریخی شہرت رکھتا ہے اور یورپ کے لوگ آج بھی اس کے گن گاتے ہیں۔ اس نے عورتوں کے بارے میں جو قوانین بنائے تھے اس میں کے چند یہ ہیں:

"اگر کسی جائداد کی وارثہ کا شوہر نامرد ہو تو وہ اس کے قریب ترین رشتہ دار سے تعلقات زناشوئی قائم کر لے۔

ہر شخص کو اختیار ہے کہ کسی کو زنا کرتے ہوئے دیکھے تو خود قتل کر دے۔

زنا بالجبر کی سزا سو درہم جرمانہ ہے

عورت کو زنا پر پھسلانے کا جرمانہ بیس درہم ہے۔

اس قانون سے رنڈیاں مستثنیٰ ہیں جو علانیہ عصمت فروشی کرتی ہیں، بیٹی اور بہن کو فروخت کرنا ناجائز ہے لیکن اگر وہ کنواری ہوتے ہوئے بدفعلیاں کریں تو ان کو بیچنا جائز ہے۔"

(مشاہیر یونان و روما ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی)

اس کو تو جانے دیجیے کہ اخلاقی حیثیت سے یہ قوانین کتنے ضرر رساں ہیں یہاں یہ دیکھیے کہ یہ ایک دوسرے سے کتنے متضاد ہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ فی الحقیقت انسان زندگی کی سعادت افلاح کے لیے قانون بنانے کا اہل ہی نہیں ہے وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھ کر ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور آج بھی کھا رہا ہے۔

نوع انسانی کے یہ وہ بلند پایہ طبقے ہیں جن سے انسان کی بھلائی اور اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے، ان میں سے ہر ایک طبقے کا مختصر جائزہ لیا گیا، ان میں سے کسی طبقے کی پیروی واتباع انسانوں کو ان کی منزل مقصود تک نہ پہلے لے جا سکی ہے اور نہ آج پہنچا سکتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ صنف انسانی کے یہ بلند طبقے صرف تاریخ کی زینت ہیں بلکہ آج بھی کچھ مزید وسعت و ترقی کے ساتھ موجود ہیں لیکن ان کے اذکار و اعمال کا ہمیں جائزہ لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ براہ راست ہم خود ان کے افکار و اعمال کے نتائج بھگت رہے ہیں، اگر ان میں سے کسی کی پیروی کرنے سے امن وسلام کا مقصد حاصل ہو سکتا تو پھر یہ سوال پیدا ہی کیوں ہوتا۔ یہ تو انھیں کے اعمال و افکار ہیں جو دنیا کی جہنم کدہ بنائے ہوئے ہیں، انسانیت درد و کرب سے کراہ رہی ہے اور کوئی راہ نجات نہیں ملتی لیکن تاریخ کا جائزہ ابھی ختم نہیں ہوا، انسانوں کا ایک گروہ اور ہے جس کی طرف ہم نے ابھی توجہ نہیں کی، یہ گروہ کون ہے؟

یہ وہ مقدس و برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کے ازلی و ابدی پیغام نے دلوں کی دنیا بدل دی ہے اور جن کے اعمال و افکار کے نور نے ہمیشہ ظلمت کدہ دہر کو اجالا بخشا ہے، آج جہاں کہیں بھی

نیکی و نیک خوئی کا نور اور اخلاق عالیہ کی جو بھی موجود ہے وہ انہیں کا عطیہ ہے، دنیا کے جس گوشے میں بھی رحم، انصاف، ہمدردی، غم خواری و غم گساری، مواسات و مواخات اور انسانیت و شرافت پائی جاتی ہے وہ اسی برگزیدہ جماعت کے کسی نہ کسی فرد کی دعوت و تبلیغ اور عملی نمونہ کا دائمی اثر ہے۔

ہم اور آپ اور دنیا کے دوسرے لوگ اس برگزیدہ جماعت کو انبیاء کرام علیہم السلام کے نام سے جانتے ہیں خدا کے یہ برگزیدہ بندے دنیا کے کسی ایک ہی خطے یا کسی ایک ہی قوم میں نہیں آئے بلکہ تمام ملکوں اور قوموں میں آئے اور انھوں نے ہر جگہ خدا کا ازلی و ابدی پیغام پہنچایا۔

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ٥ (فاطر:۲۴)

"کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا کی طرف سے ڈراوا سنانے والا نہ آیا ہو۔"

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ٥ (الرعد:۷) "ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔"

آج دنیا کی قوموں میں نیکی و شرافت کا جتنا بھر بھی جوہر موجود ہے وہ انھیں بزرگوں کی برکتوں کا اثر ہے، اگر خدا کے یہ پیغمبر نہ آئے ہوتے تو یہ دنیا صرف بدی و شیطنت کا اکھاڑا بن کر کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ خدا کے ان برگزیدہ رسولوں نے اپنے پیچھے جو نقوش قدم چھوڑے وہ دنیا سے محو نہیں ہوئے، ان کی راہ پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ لوگ چلتے رہے ہیں اور آج بھی بڑے سے بڑا دنیا پرست، نیکی، اچھائی اور شرافت کا خیال کرتا ہے تو اس کی نگاہ انھیں بندگان حق پر رکتی ہے کہ ان چیزوں کا مرکز و مخزن انھیں کی پاک ہستیاں ہیں، یہ انسانوں کا وہ اعلیٰ ترین طبقہ ہے جس کی برابری کا دعویٰ بنی نوع انسان کا کوئی طبقہ نہیں کرسکتا۔ اوپر جن طبقوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے وہ ان خاصان خدا کے مقابلے میں اتنے ذلیل و حقیر ہیں کہ اس سلسلے میں ان کا نام لینا بھی گستاخی ہے لیکن بہرحال ہم اچھوں اور بروں کو سامنے رکھ کر ہی اچھائی اور برائی میں تمیز کرسکتے ہیں اور اس تقابلی مطالعہ ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں جن کی پیروی ہمیں فلاح دارین کی دولت بخش سکے۔

انسانیت کا عہد امن وسلام

یہ انسان ہمیشہ سے بے چینی و بے اطمینانی اور اضطراب و انتشار کا شکار نہیں رہا ہے بلکہ ایک طویل عہد تک اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ اس وقت نہ عقائد و افکار کی یہ پریشانیاں تھیں اور نہ یہ گروہ بندیاں، نہ اجتماعی قتل و غارت کے یہ ہنگامے تھے اور نہ ہوس اقتدار کی یہ زیادتیاں۔ سب سے پہلے انسان آدم، نہ صرف معمولی انسان بلکہ انسانیت کے فرد کامل تھے، وہ

اپنے خالق کے پاس سے زندگی بسر کرنے کی واضح ہدایات لے کر آئے تھے، وہ اور ان کی اولاد ان ہدایات کی پابند تھی اور جب تک یہ پابندی رہی امن وسکون بھی رہا لیکن جیسے جیسے اولاد آدم کی تعداد بڑھتی گئی وہ ان پابندیوں سے جی چرانے لگی اور رفتہ رفتہ ان میں کے بہتیرے لوگ انہیں بالکل بھول گئے۔ اس کے نتیجے میں کشمکش شروع ہوئی، بے چینی اور بے اطمینانی انسانی معاشرے میں گھس آئی اور امن وسکون ختم ہوا۔ انسان کی ابتدائی تخلیق اور اس کے حالات جاننے کے لیے خود انسانوں کی لکھی ہوئی تاریخیں بالکل بے کار ہیں وہ ہمیں کوئی صحیح بات نہیں بتاتیں بلکہ غلط راستے پر ڈال دیتی ہیں، کسی واقعہ کو محض ظن وتخمین سے حل کرنے کا نتیجہ ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہوسکتا اور واقعہ بھی ایسا کہ جانے اس پر کتنی مدت گزر چکی، ہمارے مبلغ علم کا تو یہ حال ہے کہ ہم متعین طور پر یہ بھی نہیں جانتے کہ سب سے پہلا انسان کب پیدا ہوا تھا، انسان کی ابتدائی تخلیق کو جاننے کا اس سے زیادہ صحیح ذریعہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ خود خالق انسان یہ بتائے کہ اس نے کیسے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا، اس لحاظ سے دنیا میں صرف ایک ہی کتاب ایسی ہے جو اس موضوع پر صحیح روشنی ڈال سکتی ہے اور وہ ہے خدا کی بھیجی ہوئی آخری کتاب ”الکتاب المبین“۔ اس کے بعد بھی کوئی اپنے ہی قیاسات کی بھول بھلیاں میں پھنسا رہنا چاہے تو اور بات ہے ورنہ ہمیں اس کے بارے میں جتنی باتیں جاننے کی فی الواقع ضرورت ہے وہ سب اس نے بتادی ہیں۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ یہ انسان بے چینی واضطراب کا شکار ہمیشہ سے نہیں بلکہ اس دن سے ہے جس دن سے اس نے خدا کی ہدایات فراموش کی ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ الخ (البقرہ:۲۱۳)

”ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوگئے تھے ان کا فیصلہ کرے الخ“۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک مفسر لکھتے ہیں:

”ناواقف لوگ جب اپنے قیاس وگمان کی بنیاد پر ”مذہب“ کی تاریخ مرتب کرتے ــــــ

ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام تک پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ اور تیرے لیے صحیح راستہ کون سا ہے اس کے بعد ایک مدت تک نسل آدم راہ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہش مند تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور اپنی ایک امت بنالے بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہ حق کو واضح کر کے انھیں پھر سے ایک امت بنا دیں۔" (تفہیم القرآن۔ ج ۱)

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا سررشتہ ہے جو ہاتھ میں آ جائے تو زندگی کی ساری گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں اور یہ گم ہو تو پھر اور الجھتی چلی جاتی ہیں۔ انسان کے اضطراب و انتشار کی علت العلل یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت اور اپنا مقصد وجود ہی بھول گیا ہے۔

اس خود فراموشی کے نتیجے میں ہوس اقتدار اس پر غالب آ گئی ہے اور ہوس اقتدار نے اسے قانون سازی کی غلط پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے، جتنے انبیاء کرام علیہم السلام بھی تشریف لائے انھوں نے انسان کو اسی مدہوشی سے نکالنے کی سعی کی، اسی نشے کو اتارنے کا سامان کیا۔ انھوں نے اس کو اس کی اصل حیثیت اور مقصود وجود یاد دلایا اور دنیا گواہ ہے کہ جب بھی انسانوں کے کسی گروہ نے مدہوشی ختم کر کے اپنی صحیح حیثیت اختیار کر لی ہے ان کی زندگیاں امن و سکون کا گہوارہ بن گئی ہیں، آسمان و زمین نے ان پر اپنی برکتیں نازل کی ہیں، کائنات کے ہر ہر وجود نے ان کا خیر مقدم کیا ہے اور انھیں دعائیں دی ہیں، جب واقعہ یہ ہے تو تمام طبقات انسانی میں اگر کوئی طبقہ اس لائق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے تو وہ انھیں انبیاء کرام علیہم السلام کا اعلیٰ ترین طبقہ ہے، انہیں کی پیروی کر کے انسان امن و سلام کی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اوپر

مختلف طبقات انسانی کا جائزہ لیا گیا ہے آیئے اب یہ دیکھ لیا جائے کہ انبیاء ہی کی پیروی ہمیں اپنے مقصد تک کیوں پہنچا سکتی ہے؟ اس کی چند وجوہ ہیں جنہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

انبیاء کی پیروی کیوں کی جائے

(۱) انبیاء کرام علیہم السلام کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے اس میں سب سے پہلی چیز جو ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ان کی دعوت کی یکسانی ہے۔ ان کے پیغام، ان کی دعوت اور ان کی پکار کا آپ مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ اس پورے سلسلۃ الذہب میں کہیں کوئی کجی اور کہیں کوئی اختلاف نہیں، جو بات ایک نے کہی وہی دوسرے نے، وہی تیسرے نے اور وہی سب نے۔ اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ وہ طبقہ جس کو انسانوں کا ''دماغ'' کہا جاتا ہے یعنی حکماء اور فلاسفر وہ کس قدر انتشار خیال کا شکار رہا ہے، دو فلسفی بھی کسی ایک نظریے پر متفق نہ ہو سکے لیکن یہاں دیکھیے کہ تضاد کا کیا سوال، اصل دعوت میں کہیں ذرہ برابر بھی اختلاف نہیں، کیا ان کے دعوت و پیغام کی یہ یکسانی بلا وجہ ہے؟ کیا فلاسفروں کے نظریات کا تضاد و انتشار بلا وجہ ہے؟ نہیں بلکہ دونوں بالوجہ ہیں۔

فلاسفروں کے تضاد و انتشار کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کی بنیاد خود ان کا اپنا دماغ ہوتا ہے، وہ باتیں محض ظن و تخمین کی پیداوار ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کے دماغ کی صلاحیتیں علیحدہ ہیں، اس کے قیاسات الگ ہیں، یکسانی آئے تو کہاں سے؟ انبیاء کرام علیہم السلام کی یکسانی فکر و دعوت کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وحی الٰہی کے مطابق کہتے ہیں۔ وہ خدا کے پیغامبر ہوتے ہیں پیغام ان کا اپنا نہیں بلکہ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا ہے، ان کی دعوت کی بنیاد ظن و تخمین پر نہیں، علم و یقین پر ہوتی ہے، اس لیے اس میں نہ تضاد ہوتا ہے اور نہ انتشار، نہ کج و پیچ ہوتا ہے نہ اضطراب، وہ اپنا کام پوری روشنی میں شروع کرتے ہیں اندھیرے کا وہاں گزر نہیں، پورے شرح صدر و یقین کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، تذبذب، شک اور بے یقینی ان کے پاس بھی نہیں پھٹکتی اور یہ خود اس بات کا اٹل ثبوت ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ ان کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو یہ یکسانی ممکن نہ تھی اختلاف ناگزیر ہوتا۔ یہی بات ہے جسے قرآن یوں کہتا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا۝ (النساء:۸۲)

"کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی"

(۲) جو پیغام انھوں نے دیا وہ یہ تھا کہ انسان خدا نہیں بلکہ بندۂ خدا ہے، اللہ رب العالمین کے سوا کوئی الٰہ نہیں تمام کائنات ہست و بود پر اسی ایک کی فرماں روائی ہے کوئی دوسرا فرماں روا نہیں، تمام اختیار و اقتدار کا مالک وہی ہے کوئی دوسرا اس کا ساجھی نہیں، انسان محض بندہ ہے اور اس کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کی بندگی کرے، یہ زندگی مستعار آزمائش و امتحان کی مہلت مختصر ہے، اس کے بعد ایک دوسرے زندگی اور ہے جس میں اس زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا نتیجہ ہر ایک کے سامنے آنے والا ہے، خدا کی بندگی و اطاعت کا طریقہ وہ ہے جو خدا اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بتائے نہ وہ جو انسان خود گھڑ لے، خدا کے اتارے ہوئے قانون کی پیروی دنیا میں بھی امن، چین اور سکون بخشے گی اور آخرت میں بھی، اور اس سے اعراض، بے چینی، بے اطمینانی اور اضطراب یہاں بھی پیدا کرے گا اور وہاں بھی۔ پہلے یہ واضح ہو چکا ہے کہ ہوس اقتدار اور قانون سازی یہی دو چیزیں ہمیشہ دنیا کو جہنم بناتی رہی ہیں اور آج بھی بنا رہی ہیں۔ انبیاء کی دعوت ان دونوں کا استیصال کر دیتی ہے اور انسان کو ایک ایسے اقتدار کے سامنے جھکا دیتی ہے جو نہ صرف یہ کہ سب سے بلند و بالا ہے۔ بلکہ سب پر یکساں مہربان ہے، اس کا علم غیر محدود، اس کی طاقت ناقابل شکست اور اس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں ہے، وہ نفسانیت سے خالی، جذبات سے ماورا اور ظلم کے شائبے سے بھی پاک ہے۔ ایک ایسے مقتدر اعلیٰ کے سامنے جھکنا نہ صرف انسان کی فطرت کے مطابق بلکہ اس کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

(۳) تیسری چیز جو خدا کے ان برگزیدہ بندوں کی طرف دل کو کھینچتی ہے وہ ان کا بلند کردار اور ان کا نمونۂ عمل ہے، ان کے اخلاق و اعمال کی پاکیزگی اس حد پر پہنچی ہوئی ہے جس سے آگے کوئی انسان بڑھ نہیں سکتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں، نری لفاظی و شیریں بیانی ان کا شیوا نہیں، انھوں نے لوگوں کو اپنے اقتدار اور اپنی بندگی کی طرف نہیں بلایا اور پھر اپنی زندگی کی ہر حرکت سے اس کا ثبوت بھی دیا۔ انھوں نے لوگوں پر حکومت کرنے کا تصور بھی نہیں کیا، انھوں نے خدا کی بندگی ہی نہیں کی بلکہ اس بندگی کو اپنی سب سے بڑی فضیلت بھی سمجھا، انھوں نے انسان کی ہدایت کا پورا نظام مرتب کیا اور عملاً اس کو کر کے دکھایا۔ انھوں نے فرائض

انسانی کی توضیح کی، اور ہر فرض کو خود انجام دے کر بتایا۔ غرض ان کی دعوت و تبلیغ کے پیچھے ان کے حسنِ عمل کا نمونہ بھی ہمیشہ موجود رہا اور کہا جا چکا ہے کہ انسان کو سنوارنے میں سب سے بڑا حصہ نمونۂ عمل ہی کا ہوتا ہے۔ ورنہ نری لفاظی تو بہتوں نے کی ہے۔

(۴) چوتھی چیز جو ادھر ہمیں مائل کرتی ہے وہ ان کا طریق دعوت و تبلیغ ہے، وہ چونکہ خدا کی براہِ راست نگرانی میں کام کرتے تھے اس لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی یقیناً خدا ہی کا بتایا ہوا تھا اور خدا سے بڑھ کر انسان کی نفسیات کا جاننے والا کون ہوسکتا ہے۔ اس لیے انبیاء کی دعوت و تبلیغ میں ایسی ترتیب و تدریج، ایسی ہمدردی و للہیت اور ایسا حسن و جمال نظر آتا ہے کہ سلیم الطبع لوگ اس سے اعراض نہیں کرسکتے وہ اسے ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پانے لگتے ہیں، ان کی باتوں میں سوزِ دل اور ان کے کاموں میں ان کی روح کی پاکیزگی شامل ہوتی ہے اور پتھر سے پتھر دل ان کی باتوں کو سن کر ان کے کاموں کو دیکھ کر پسیج جاتا ہے۔

یہاں انبیاء کرام کی تمام خصوصیات و امتیازات کا استقصا مقصود نہیں۔ یہ مختصر جائزہ بھی انہیں دیگر طبقات انسانی سے اس قدر ممتاز کر دیتا ہے کہ دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور ایک ایسا شخص جو واقعی دل سے امن، چین اور سکون کا خواہش مند ہو وہ بآسانی یہ طے کرسکتا ہے کہ اسے کس کی پیروی اختیار کرنی چاہیے اور کس کی پیروی سے اس کا مقصد حاصل ہوسکے گا، ان تمام جائزوں نے ہمیں اس نتیجے تک پہنچایا کہ طبقات انسانی میں سے صرف ایک طبقہ اور انسانی گروہوں میں سے صرف ایک گروہ انبیاء کرام کا ایسا ہے جس کی پیروی و اطاعت دنیا سے اس بے چینی و اضطراب کو دور کرسکتی اور ہمیں دنیا و آخرت میں کامیاب و بامراد بنا سکتی ہے۔

آخری کتاب اور آخری نبی

دنیا میں سیکڑوں اور ہزاروں انبیاء اپنے اپنے وقت پر آئے، خدا نے ان پر ہدایتیں نازل کیں، صحیفے اور کتابیں اتاریں، انھوں نے تبلیغ رسالت کی خدمات انجام دیں اور پھر اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ خدا نے جو کتابیں نازل کی تھیں کیا وہ سب بعینہٖ ہمارے پاس موجود ہیں اور کیا تمام انبیاء کے حالات اور ان کی سیرتیں تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں، اس لحاظ سے جب ہم تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں میں سے اس وقت صرف ایک ہی کتاب ایسی رہ گئی ہے جو بعینہٖ و بلفظہٖ اسی طرح موجود ہے جس طرح نازل

ہوئی تھی اور تمام انبیاء کرام میں تنہا آیک ہی نبی مکرم ایسے ہیں جن کی سیرت پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ کتاب خدا کی اتاری ہوئی آخری کتاب قرآن مجید اور یہ نبی مکرم خدا کے بھیجے ہوئے آخری نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ان تمام کتابوں کی بنیادی وضروری باتیں محفوظ کرلی ہیں جو اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں، نبی آخری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تمام انبیاء سابقین کے اخلاق فاضلہ وصفات حمیدہ کے جامع ہیں۔ اور دوسرا امتیاز یہ ہے کہ آپ کو جو شریعت عطا کی گئی وہ بھی کامل و مکمل ہے، قیامت تک اس میں کسی ترمیم و تنسیخ کی نہ ضرورت ہے اور نہ کسی کو اس کا حق ہے۔ اب دنیا میں قرآن ہی وہ تنہا کتاب ہدایت ہے جس میں انسان کے تمام پیچیدہ مسائل کا حل موجود ہے اور گروہ انبیاء میں تنہا سیدنا محمد رسول اللہ ہی وہ نبی ہیں جن کی زندگی پوری بنی نوع انسان کے لیے اسوۂ دائمی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا بلکہ ایسے انتظامات فرمائے کہ نبی آخری سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا ایک ایک گوشہ پوری تفصیل کے ساتھ محفوظ رہ گیا اور اب جس طرح قرآن قیامت تک پوری حفاظت کے ساتھ موجود رہے گا اسی طرح صاحب قرآن کی سیرت بھی محفوظ رہے گی اور عقل تقاضا کرتی ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے، یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن تو موجود رہے اور کوئی ایسا نمونہ محفوظ نہ رہے جسے سامنے رکھ کر ہم قرآن کو سمجھ سکیں، قرآن نے جب یہ اعلان کیا تھا ''وَلَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ تو اس اعلان کا مطلب ہی یہ تھا کہ قرآن کے ساتھ ساتھ یہ اسوۂ حسنہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ چنانچہ یہ آج بھی محفوظ ہے اور کل بھی محفوظ رہے گا۔ جس طرح کسی انسانی طاقت کی یہ مجال نہیں کہ قرآن کو بدل دے یا اسے دنیا سے ناپید کردے اسی طرح کسی انسان نما گروہ شیطانی کی یہ مجال نہیں کہ اسوۂ رسول وسنت رسول کو ناپید کرسکے یا اس میں اپنی خواہشات نفس کے مطابق رد وبدل کردے، قرآن بھی موجود رہے گا اور سنت رسولؐ بھی اور اس پر عمل کرنے والے بھی۔

آئیڈیل سیرت کی شرطیں

کوئی ایسا فرد جو تمام دنیا کے انسانوں کے لیے نمونۂ عمل ہو اور کوئی ایسی سیرت جو ایک آئیڈیل سیرت کہی جاسکے اپنے اندر کچھ خصوصیات، شرائط اور امتیازات رکھتی ہے جب تک وہ شرائط نہ پائی جائیں نہ کوئی فرد سب کے لیے نمونۂ عمل بن سکتا ہے اور نہ کوئی سیرت آئیڈیل سیرت

ہو سکتی ہے۔ وہ شرائط وخصوصیات کیا ہیں ہم ذیل میں انہیں اختصار کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

ایک آئیڈیل سیرت کے لیے:

(۱) سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا تاریخی استناد شک وشبہ سے بالاتر ہو، اس کی تاریخی حیثیت مستند ومکمل ہو، اول سے آخر تک کہیں خلا نہ پایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے سوانح وحالات پیش کیے جارہے ہیں وہ تاریخ وروایت کے لحاظ سے قابل استناد ہوں، ان کی حیثیت قصوں کہانیوں کی نہ ہو کیونکہ نفسیات انسانی کا تجربہ یہ ہے کہ چاہے کتنی ہی اچھی بات کیوں نہ کہی جارہی ہو اور چاہے کتنے ہی عمدہ حالات کیوں نہ بیان کیے جارہے ہوں اگر اس کے متعلق اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ محض افسانہ ہے تو اس سے وہ کوئی گہرا اور دیرپا اثر قبول نہیں کرتا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اس سے خوش ہو لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ایسا ہو تو اچھا ہے لیکن اس کے تحت الشعور میں یہ بات جاگزیں ہو جاتی ہے کہ ایسا ہوا نہیں ہے۔ اگر کسی واقعہ کی تاریخی حیثیت مشتبہ بھی ہو جائے تو اس کی تاثیر ختم ہو جاتی یا بہت کم ہو جاتی ہے اس لیے ایک آئیڈیل سیرت کے لیے تو یہ بات سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے کہ اس کے تمام اجزا پر یقین ہو خصوصاً جب اسے دنیا کے سامنے اسوہ اور نمونہ کے طور پر پیش کیا جائے ورنہ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے بلکہ کہہ اٹھتا ہے کہ صاحب یہ محض خیالی باتیں ہیں ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس شرط کو سامنے رکھ کر دیکھیے کہ خود انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت میں وہ کون ہے جس کی سیرت اس معیار پر پوری اتری ہے، آپ تحقیق کریں گے تو پائیں گے کہ اس معیار پر صرف سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی پوری اترتی ہے اور یہ اس لیے کہ آپ ہی کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آخری نبی بنا کر بھیجا تھا اور آپ ہی کی سیرت کا تاریخی استناد سب سے زیادہ ضروری تھا۔ مورخین نے اس سلسلہ میں جو تحقیقات کی ہیں اور ان کے جو بیانات ہیں انہیں یہاں نقل کیا جا سکتا تھا لیکن طوالت کے خوف سے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔

(۲) ایک آئیڈیل سیرت کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ کامل ہو، کسی انسان کی سیرت کو جب ہم دائمی نمونۂ عمل کے طور پر پیش کریں گے تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پوری کی پوری ہمارے سامنے ہو، کوئی واقعہ، کوئی سانحہ اور کوئی اہم حالت پردۂ خفا میں نہ ہو، تمام حالات و سوانح بالکل واضح طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں تاکہ دنیا کو بتایا جا سکے کہ معیاری سیرت ایسی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی آپ مختلف سیرتوں کو جانچیں گے تو صرف ایک ہی سیرت اس

معیار پر پوری اترے گی، سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا صحیفہ حیات ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، یہاں کوئی واقعہ ایسا نہیں جو اندھیرے میں ہو۔ ہر واقعہ آفتاب کی طرح روشن ہے اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا تھا، آپ کی سیرت کے ہر حصہ کو دنیا کے سامنے رہنا ہی چاہیے تھا ورنہ پھر کسی آئیڈیل سیرت اور کسی دائمی نمونۂ عمل کا وجود ہی باقی نہ رہتا کیونکہ بہتیرے انبیاء کرام تو ایسے ہیں جن کا نام بھی ہم نہیں جانتے اور جن چند کے نام جانتے ہیں ان کی سیرت کے محض تھوڑے حصے ہمارے سامنے ہیں آج ان کے پورے سوانح حیات کو مکمل طور پر پیش کرنا ممکن نہیں۔

(۳) تیسری شرط ایک آئیڈیل سیرت کے لیے جامعیت ہے، جامعیت کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جو مختلف طبقات انسانی پائے جاتے ہیں ہر ایک کے لیے اس میں نمونۂ عمل موجود ہو، نیز یہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ پوری زندگی کے لیے اس میں نمونہ موجود ہو ایسا نہ ہو کہ بعض شعبۂ زندگی کے لیے تو نمونہ ہو اور بعض کے لیے نہ ہو، دین و مذہب، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مجموعے کا نام ہے، ہمیں تفصیل سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسان اور خدا کے تعلق کی نوعیت کیا ہے اور اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ انسان اور انسان کے باہمی تعلقات کی نوعتیں کیا ہیں اور اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں، خدا کے بارے میں ہمارے کیا اعتقادات ہونے چاہئیں، اس کی ذات و صفات کا علم کتنا اور کس طرح حاصل ہونا چاہیے، اس کے ساتھ قلبی لگاؤ کی کیا کیفیت ہونی چاہیے، اس کی رضا کیسے حاصل ہو، اس کے قرب کے حصول کا ذریعہ کیا ہے، اس کی عبادت و اطاعت کس طرح کرنی چاہیے اور اس کے حدود و شروط کیا ہیں؟ غرض اس طرح کے بیسیوں سوالات ہیں جو خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی نسبت سے پیدا ہوتے ہیں، پھر انسانی زندگی کے بے شمار شعبے اور مسائل ہیں جن کی تفصیل ہم جاننا چاہتے ہیں۔ ہماری معیشت و معاشرت کیسی ہو، تہذیب و تمدن کیا ہو، حکومت و سیاست کے اصول کیا ہوں، باہمی تعلقات کس طرح قائم رہیں اور ان کے فرائض و واجبات کو ادا کرنے کی عملی شکل کیا ہو؟ یہ اور اس طرح کے کتنے سوالات ہیں جو آئے دن ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، پیدائش سے لے کر موت تک انسان ہزاروں مراحل و مسائل سے گزرتا ہے اور ہر مرحلے اور ہر مسئلے میں اپنے لیے نمونۂ عمل ڈھونڈتا ہے اس لیے ایک آئیڈیل سیرت کو ان تمام باتوں کا جواب ہونا چاہیے، اس حیثیت سے بھی آپ مختلف سیر انسانی کو جانچیں گے تو صرف ایک ہی سیرت اس معیار پر پوری

اترے گی جسے ہم سیرت محمدیؐ کے نام سے جانتے ہیں۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ جس انسان کو ہم دائمی نمونۂ عمل کے طور پر پیش کر رہے ہیں اس نے زندگی کے ہر مرحلے میں صرف نظریات واقوال نہ پیش کیے ہوں بلکہ خود عمل کر کے بھی دکھایا ہو اس لیے کہ خوش کن نظریات واقوال جن کے پیچھے نمونۂ عمل نہ ہو بے کار شئے ہیں، انسانی زندگی میں اس سے سدھار پیدا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء کرام علیہم السلام ایک ہی صف میں کھڑے ہیں لیکن افسوس کہ ایک کے سوا تاریخ نے کسی نبی کے تمام نمونہ ہائے عمل کو محفوظ نہیں رکھا اس لیے اس لحاظ سے بھی کوئی سیرت پیش کی جاسکتی ہے تو وہ سیرت محمدیؐ ہی ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ دیکھیں گے کہ زندگی کے تمام مسائل میں سیرت محمدیؐ ایک واضح جواب بن کر سامنے آتی ہے۔ تعلق زن وشو انسان کا پرائیوٹ معاملہ ہے لیکن سیرت محمدیؐ کا کمال یہ ہے کہ وہ اس مسئلے کا بھی واضح عملی جواب ہمیں دیتی ہے اور یہاں بھی ہم اندھیرے میں نہیں رہتے، غرض زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے پر خود عمل کر کے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے لیے ایک دائمی ہمہ گیر اور مکمل نمونہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے اور تاریخ انسانی میں تنہا آپ ہی کی ایک ذات ایسی ہے جس کی پیروی کرتے ہوئے ہم کہیں کوئی کھٹک اور تذبذب محسوس نہیں کرتے اور پورے یقین کے ساتھ زندگی کا راستہ طے کرتے ہیں۔ صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

(۵) ایک آئیڈیل سیرت کے لیے پانچویں شرط توسط واعتدال ہے یعنی مسائل زندگی میں افراط وتفریط سے بچ کر بیچ کی راہ اختیار کرنا۔ خدا کی پرستش وعبادت ہو یا کسی انسان کی عقیدت ومحبت، حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد یا خود اپنے نفس کے حقوق غرض ہر جگہ وہ طرز عمل اختیار کیا جائے جو افراط وتفریط سے بچا ہوا ہو، اکثر ایسے لوگوں کی سیرتیں بھی جو خدا پرست اور دین دار ہیں حد اعتدال سے متجاوز ہوتی ہیں اس لیے وہ کتنے ہی مقدس کیوں نہ ہوں ہمارے لیے نمونۂ عمل نہیں ہو سکتے، اس حیثیت سے بھی سیرت محمدیؐ ہی ایک بلند معیار بن کر ہمارے سامنے آتی ہے، یہ ایک ایسی آئیڈیل سیرت ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔

ہادیِ عالم کی خصوصیات

اب ہم ان چند خصوصیات کا ذکر کریں گے جو ایسے شخص میں ہونی چاہئیں جو تمام دنیا کا

رہنما بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

(۱) ایسے شخص کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں جو کام کیے ہوں وہ کسی خاص قوم، نسل اور طبقے کی بھلائی سے تعلق نہ رکھتے ہوں بلکہ تمام انسانوں کی بھلائی سے تعلق رکھتے ہوں، ان کاموں سے دنیا کے کسی بھی خطے کا انسان فائدہ اٹھا سکتا ہو اور نمونۂ عمل کے طور پر اپنے سامنے رکھ سکتا ہو۔ اس کے کام ملکی وقومی لیڈروں کے کام سے مختلف ہوتے ہیں، ملکی وقومی لیڈر کا مطمحِ نظر اپنی قوم اور اپنے ملک کا فائدہ ہوتا ہے عام ازیں کہ وہ کسی دوسرے ملک وقوم کے لیے مفید ہو یا مضر، اصلاً وہ کسی دوسرے کی طرف دھیان نہیں دیتا بلکہ بسا اوقات دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنی قوم اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی سعی کرتا ہے، ظاہر ہے کہ کسی ایسے شخص کو کوئی دوسرا ملک اور کوئی دوسری قوم اپنا رہنما تسلیم نہیں کر سکتی بلکہ بعض اوقات اس سے نفرت کرتی اور اسے اپنا دشمن سمجھتی ہے۔

موجودہ دور میں ہر ملک کا لیڈر عام انسانی ہمدردی اور بین الاقوامیت کے گن گاتا ہے لیکن اس کی حقیقت ایک فیشن کے سوا کچھ اور نہیں، اس کا عمل اس کے قول کی خود ہی تردید کر دیتا ہے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے پوری تاریخ انسانیت میں ہمارے سامنے ایک ہی ہادیٔ عالم کا نام آتا ہے، سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ نے جو کام کیے ہیں وہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ہمیشہ تمام انسانوں کی بھلائی آپ کے پیش نظر رہی ہے، آپ عرب میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور وہیں وفات پائی لیکن اپنی تمام زندگی میں جو کام آپ نے کیے وہ صرف عرب ہی کے لیے مفید نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کے افراد نے بھی انہیں قبول کیا اور آپ کو اپنا رہنما بنایا۔

(۲) رہنمائے عالم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جو دعوت دی ہو، جو پیغام سنایا ہو اور جو اصول پیش کیے ہوں وہ بھی عالم گیر ہوں، ان سے تمام دنیا کے انسان رہنمائی حاصل کر سکتے ہوں، کسی خاص قوم وملک کے ساتھ مخصوص ومحدود نہ ہوں۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان اصولوں کی افادیت وقتی وعارضی نہ ہو بلکہ وہ ہر زمانے اور ہر عہد کے لیے یکساں مفید ہوں، وہ قیدِ زمان ومکان سے آزاد ہوں، ہر جگہ کام آسکتے ہوں اور ہر وقت کام آسکتے ہوں۔

ان دو خصوصیتوں کے لحاظ سے بھی آپ تلاش کریں گے تو تمام رہنمایان عالم میں صرف ایک ہی رہنما معیار پر پورے اتریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو یہ تمام خصوصیات عطا کی تھیں اور اس لیے عطا کی تھیں کہ ان کے بعد اس دنیا میں کوئی نبی آنے والا نہ تھا۔ اس نے آپ کو تمام دنیا کا ہادی و رسول بنا کر بھیجا اور آپ پر جو کتاب نازل کی وہ بھی تمام عالم کے لیے ہدایت نامۂ عام کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کسی ایک ملک یا کسی ایک قوم کی حصہ خاص نہیں بلکہ تمام دنیا کی میراث عام ہے۔

نتیجۂ بحث

یہ جو مختصر تاریخی جائزہ لیا گیا اور اب تک جو باتیں لکھی گئیں ان سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ انسان اگر اپنے مسائل زندگی کا صحیح حل تلاش کرنا اور دنیا و آخرت میں امن، چین اور سکون چاہتا ہے تو اسے خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کی پیروی اختیار کرنی چاہیے اور چونکہ اب گروہ انبیاء میں بھی صرف سیدنا محمد رسول اللہ علیہ وسلم ہی کی آئیڈیل سیرت دائمی نمونۂ عمل کے طور پر موجود و محفوظ ہے اس لیے انسانیت کی واحد راہ نجات صرف آپؐ ہی کی پیروی و اتباع ہے۔ آپ ہی کے پیچھے چل کر وہ فلاح دارین حاصل کر سکتی اور آپ ہی کا اسوہ اختیار کر کے وہ منزل امن و سلام تک پہنچ سکتی ہے، دنیا کے لوگ جس قدر جلد اس حقیقت کو پالیں اسی قدر زیادہ ان کے لیے مفید ہوگا ورنہ ان کی زندگی ہمیشہ بدامنی و بے چینی، بے آرامی و بے اطمینانی، انتشار و اضطراب اور درد و کرب کا شکار رہے گی۔ باقی رہے وہ لوگ جو دنیا کے آخری نبی کو اپنا رسول و ہادی مانتے ہیں ان سے اس کے سوا اور کیا کہا جائے۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

(ماہ نامہ زندگی رام پور، مئی، جون ۱۹۵۵ء)

نوٹ:۔ اس مقالے کی تیاری میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات مدراس سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

سیرت کا مطالعہ اور اس سے استفادے کا طریقہ

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کو میں نے حسب ذیل پانچ نکات میں تقسیم کر دیا ہے:

(۱) سیرت سے مراد کیا ہے۔ (۲) مطالعۂ سیرت کی اہمیت کیا ہے۔ (۳) اس مطالعہ کا مقصد کیا ہے (۴) سیرت نبویؐ کا ماخذ کیا ہے۔ (۵) اس سے استفادے کا طریقہ کیا ہے؟

(۱) سیرت سے مراد کیا ہے؟

سیرت نبویؐ کے دو بڑے حصے ہیں۔ایک کا تعلق آپ کی ذات گرامی سے ہے، اور دوسرے کا تعلق اس دین، اس نظام اور اس پیغام سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل کیا تھا اور جس پر خود عمل کر کے آپ نے دکھایا۔آپ کی ذات گرامی سے جس حصے کا تعلق ہے اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ایک یہ کہ آپ کہاں پیدا ہوئے، کب پیدا ہوئے، کس خاندان سے تھے اور نبوت سے پہلے آپ کے سوانح حیات کیا ہیں؟ نیز یہ کہ ظہور قدسی کے وقت جزیرۃ العرب کے بالخصوص اور پوری دنیا کے بالعموم حالات کیا تھے؟ دوسری نوعیت یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے آخری رسول کو بحیثیت رسول کیا مقام عطا فرمایا ہے؟ سیرت نبویؐ کے دوسرے حصہ کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔ وہ ایک مکمل اور ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے۔سیرت نبویؐ سے مراد یہ دونوں حصے ہیں۔

(۲) مطالعۂ سیرت کی اہمیت

اس کی ایک واضح ناقابل انکار اہمیت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور پیروی کے بغیر دین اسلام پر عمل ممکن نہیں ہے۔کوئی مومن، اسلام کے اولین حکم، اقامتِ صلوٰۃ پر بھی عمل نہیں کر سکتا۔اگر آپؐ کی قولی و عملی تعلیم اس کے سامنے نہ ہو۔داعیان حق اور اقامت دین کی جدوجہد میں حصہ لینے والوں کے لیے اس کی مخصوص اہمیت یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ یہ مہم سر نہیں کر سکتے۔کیونکہ اقامت دین کا آخری نمونہ حضورؐ کی سیرت ہی میں موجود ہے۔اگر اس کو نگاہوں

سے اوجھل کر دیا جائے تو اقامت دین کی جدوجہد کسی اور سمت مڑ جائے گی اور مڑنے والوں کو اس کا شعور بھی نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے آپ کی سیرت کو قیامت تک کے لیے واجب العمل اسوۂ حسنہ کی حیثیت دے دی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا ؕ (الاحزاب:۲۱)

"اور تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ ان کے لیے جو اللہ کی ملاقات اور روز آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو زیادہ یاد کرتے ہیں۔"

مطالعۂ سیرت کی اہمیت کے پیش نظر یہ آیت بے حد قابل غور ہے اور ضروری ہے کہ ہر داعیِ حق کے ذہن میں تازہ رہے تاکہ وہ دعوت حق کے ہر موڑ پر اس سے روشنی حاصل کر سکے۔ ہم اس آیت کریمہ کے چند پہلوؤں پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ اس آیت کا موقع و محل اور اس کا پس منظر ہے۔ موقع و محل غزوۂ احزاب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس غزوے کی اہمیت یہ ہے کہ پوری سورہ کا نام ہی "الاحزاب" رکھ دیا گیا ہے۔ اس غزوے کی خصوصیت یہ ہے کہ قبیلۂ قریش، دیگر قبائل اور یہودیوں کی متحدہ و مشترکہ طاقت نے مدینہ منورہ کی چھوٹی سی بستی پر یلغار کی تھی۔ یہ بات عرب کی تاریخ میں بالکل نئی تھی کہ اس طرح کی متحدہ و مشترکہ طاقت نے کسی بستی پر حملہ کیا ہو۔ یہ صرف ان کی اسلام دشمنی تھی جس نے سب کو متحد کر دیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام غیر اسلامی طاقتیں خواہ ان کے درمیان باہمی اختلافات کتنے ہی شدید ہوں اسلام کے خلاف متحد ہو جاتی ہیں۔ آج بھی یہ حقیقت کھلی آنکھوں سے دیکھی جا رہی ہے۔ اس انتہائی خطرناک و مصیبت ناک موقع پر منافقین نے جو روش اختیار کی تھی وہ کتے بھی اختیار نہیں کرتے۔ اس آیت سے پہلے کئی آیتوں سے انہیں بے غیرتوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اخیر میں ان کو ان کی بزدلی اور بے حمیتی پر غیرت دلانے کے لیے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصلاً یہ آیت میدان جہاد کے تعلق سے نازل ہوئی تھی اور کش مکش حق و باطل میں آپؐ کا اسوۂ حسنہ پیش کیا گیا تھا۔ لیکن آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے زندگی کے ہر شعبے میں آپ کی سیرت مبارکہ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ جو لوگ صرف نماز، روزہ اور مخصوص اوقات کے ذکر و تسبیح میں آپ کے اسوہ پر عمل کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا کامل اتباع کر لیا وہ غلط سمجھتے ہیں۔ ان کی پیروی ناقص پیروی ہے۔

دوسری چیز جو آیت کے اندر ہے وہ یہ ہے کہ ہر مدعی آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں: اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان اور ذکر کثیر۔ ایمان وہ نہیں جس کے مدعی منافقین بھی تھے بلکہ مخلصانہ، زندہ اور مضبوط ایمان ہے۔ اور ذکر کثیر ہی وہ چیز ہے جو ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کو تازگی اور تقویت بخشتا ہے اور جس کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ تمام انبیاء کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے اسوہ کو بھی سورہ ممتحنہ کی دو آیتوں میں مومنوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا۔ ہے اور اس کی ایک آیت میں تو الفاظ بھی تقریباً یہی ہیں، جو سورۂ احزاب کی اس آیت کے ہیں۔ پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

> "تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا۔ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔" (الممتحنہ:۴)

دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

> "ان ہی لوگوں کے طرز عمل میں تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے اچھا نمونہ ہے، جو اللہ اور روز آخر کا امیدوار ہو اس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔" (الممتحنہ:۶)

اس وقت ان آیتوں پر مفصل گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مطالعۂ سیرت کی اہمیت کے پیش نظر ان آیتوں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

(۳) مطالعۂ سیرت کا مقصد

مطالعۂ سیرت کے مقصد کی تعیین بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی مطالعۂ قرآن کے مقصد کی تعیین اہم ہے۔ جیسا مقصد ہوگا اسی کے لحاظ سے اس کا مطالعہ اور اس کے استفادہ بھی ہوگا۔ اگر کوئی محدود مقصد ہو تو اسی کے اعتبار سے سیرت کا مطالعہ بھی محدود ہوگا اور اس سے استفادہ بھی۔ فرض کیجیے کہ کسی شخص کا مقصد صرف یہ جاننا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقتوں اور تہجد کی نمازیں کتنی اور کس طرح ادا فرماتے تھے۔ سو کر اٹھتے تو کیا کرتے تھے۔ مختلف اوقات میں کیا دعائیں

مانگتے تھے۔ اور آپ کی نشست و برخاست کیسی تھی تو وہ انہیں چیزوں کے مطالعہ کو اہمیت دے گا اور انہیں سے استفادہ کرے گا۔

حضورؐ کی تبلیغ دین کی کوششوں، سفر طائف کی صبر آزمائیوں، بدر وحنین کی جنگوں اور کشمکش حق و باطل کی مزاحمتوں کے مطالعہ سے اس کو کوئی حقیقی دلچسپی نہ ہوگی اور سیرت کے اس حصہ پر عمل اور اس سے استفادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ شخص مقرر ہو تو زیادہ سے زیادہ ان چیزوں کو جلسہ ہائے سیرت، مجالس وعظ کی زیبائی اور اپنی مقبولیت کے لیے استعمال کرے گا۔ اس کے برخلاف جو شخص اپنی پوری زندگی میں سیرت نبویؐ سے رہنمائی کا خواہش مند ہوگا۔ تبلیغ اسلام اور اقامت دین کی جدوجہد کو فرض سمجھ کر اس میں لگا ہوا ہوگا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے لے کر وفات تک پوری تاریخ کا اپنے مقصد کے لحاظ سے مطالعہ اور اس سے استفادے کی پوری کوشش کرے گا۔

(۴) سیرت نبویؐ کے مآخذ

اس کا پہلا، لاریب فیہ ماخذ قرآن کریم ہے۔ افسوس کہ ہندوستان میں مسلمان جب علمی و عملی حیثیت سے زوال پذیر ہوئے تو مولود سعیدی اور مولود شہیدی جیسی کتابیں سیرت نبویؐ کا ماخذ بن گئیں جو جھوٹی حکایتوں اور روایتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں بالخصوص دیہاتوں میں پڑھنے اور میلاد خوانوں کی سہولت کے لیے لکھی گئی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تھا تو انھوں نے جواب میں فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ (قرآن، آپ کا اخلاق تھا)۔ ان کا یہ تاریخی اور قیامت تک باقی رہنے والا جملہ تقریروں میں دہرایا تو بہت گیا اور اب بھی دہرایا جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ نہیں سمجھا گیا کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے اس جملہ میں دراصل قرآن کو سیرت نبوی کا پہلا ماخذ قرار دیا تھا۔ قرآن کریم سے سیرت نبویؐ مرتب کرنے کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبہ:۱۲۸)

”تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آچکا ہے جس پر تمہارا ہلاکت میں پڑنا بہت شاق ہے۔ وہ تمہاری فلاح کا حریص اور اہل ایمان کے لیے سراپا شفقت ورحمت ہے۔“

اس ایک آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کا جو چمن پر بہار لہک رہا ہے اگر قرآن اور صحیح احادیث اور سیرت و سوانح کی مستند روایات کی روشنی میں اس کی تصویر کشی کی جائے تو اس کے لیے ایک کتابچے کی ضخامت بھی کافی نہ ہوگی۔ ایک طرف اس سے وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے اور دوسری طرف اس میں اہل ایمان کے لیے شفقت و رحمت کا اظہار ہے جو رافت و رحمت الٰہی کا مظہر ہے۔ میں یہاں محض اشارات پر اکتفا کروں گا۔

اس میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ تمہارے پاس تم ہی میں سے جو رسول آیا ہے اس پر تمہارا ہلاکت میں پڑنا اور نقصان اٹھانا بہت شاق ہے۔ وہ تمہیں ہر ایسی چیز سے بچانا چاہتا ہے جو تمہارے دنیوی و اخروی نقصان و ہلاکت کا سبب بنے۔ اس کی جدوجہد اس لیے ہے کہ تم دنیا اور بالخصوص آخرت کی ہلاکت سے محفوظ رہو۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ وہ تمہارے ایمان کا، تمہاری بھلائی کا اور تمہاری فلاح دارین کا حریص ہے۔ وہ اپنے لیے تم سے کچھ نہیں مانگتا بلکہ تمہاری نجات و فلاح کے لیے اپنی جان کھپا رہا ہے۔

تیسری بات خاص طور سے مسلمانوں کے لیے کہی گئی ہے کہ وہ ان کے لیے رؤف و رحیم ہے۔ سراپا شفقت و رحمت ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ رؤف میں دفع شر کا اور رحیم میں جلب خیر کا پہلو غالب ہے۔ یعنی وہ اہل ایمان سے ہر طرح کے شر کو دور کرنا چاہتا ہے اور ان کے لیے ہر طرح کی خیر کا خواہاں ہے۔ وہ انہیں دنیا میں مامون و محفوظ اور آخرت میں کامیاب و کامران دیکھنا چاہتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کے ان تین کوزوں میں تین سمندر بند ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ خود اس پاک ذات نے آپؐ کے خلق عظیم کی شہادت دی ہے، جس نے آپ کو روشن چراغ بنا کر مبعوث کیا تھا: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍo (القلم: ۴) ''اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبہ پر ہو۔''

سیرت کا دوسرا ماخذ صحیح احادیث ہیں۔ قرآن کریم کے بعد مستند و معتبر ہونے کے لحاظ سے صحیح احادیث کا دوسرا درجہ ہے کیونکہ احادیث کے راویوں کی جتنی چھان پھٹک کی گئی ہے وہ سیرت و سوانح کے راویوں کی نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے بعد بخاری، مسلم اور موطا امام مالک صحیح ترین کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ سیرت و سوانح کی روایات صحیح احادیث کے مقابلہ میں نہیں لائی جاسکتیں۔ جہاں تک سیرت نبویؐ کے دوسرے حصے یعنی دین اسلام اور اس کی تعلیمات

کا تعلق ہے اس میں تو صحیح احادیث کے دوسرے ماخذ ہونے میں کوئی شبہہ ہے ہی نہیں اور میرے خیال میں جس حصہ کا تعلق آپؐ کی ذاتِ گرامی سے ہے اس میں بھی صحیح احادیث کو سیرت و سوانح کی روایات پر فوقیت حاصل ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتیں محفوظ کر کے ہم مسلمانوں تک پہنچا دی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حدیث کا ترجمہ پڑھیے:

> "حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں میں بہترین تھے۔ آپؐ سب سے زیادہ سخی تھے۔ آپ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ ایک رات اہلِ مدینہ کسی آواز کی وجہ سے دہشت زدہ ہو گئے۔ کچھ لوگ دریافتِ حال کے لیے آواز کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوتے ہوئے ملے۔ آپؐ دریافتِ حال کے لیے ان لوگوں سے پہلے آواز کی طرف جا چکے تھے۔ آپ ابوطلحہ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور گلے میں تلوار حمائل تھی اور آپ فرما رہے تھے۔ ڈرو نہیں، ڈرو نہیں (ڈر کی کوئی بات نہیں ہے) اور ابوطلحہ کے گھوڑے کے بارے میں جو اپنی سست رفتاری کے لیے مشہور تھا آپ نے فرمایا کہ میں نے تو اس کو دریا پایا۔"

میں نے مسلم شریف کتاب الفضائل سے حضرت انسؓ کی حدیث کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ حدیث بخاری اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی ہے۔ تیز رفتاری میں گھوڑے کو دریا سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس ایک حدیث میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جن صفاتِ کمال کا ذکر ہے اور حدیث میں بیان کیے ہوئے واقعہ سے جو کچھ مستنبط ہوتا ہے ان سب کی تفصیل کے لیے ایک مقالے کی ضخامت چاہیے۔

سیرت کا تیسرا ماخذ سیرت و سوانح کی کتابیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح پر عربی، فارسی اور اردو میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لکھی جا رہی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ اولاً چونکہ یہ کتابیں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں اس لیے ان کتابوں کی اصل ماخذ وہی ہیں۔ ان میں سیرت ابن ہشام اور علامہ ابن قیم کی زاد المعاد کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے۔ اردو میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں درج ذیل مستند، مفصل اور اہم ہیں۔

(۱) علامہ شبلیؒ اور علامہ سلیمان ندویؒ کی سیرت النبیؐ، اس کتاب کی سات جلدیں سیرت نبویؐ کا دائرۃ المعارف ہیں۔ (۲) علامہ سلیمان منصور پوریؒ کی رحمۃ للعالمین۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ مختصر متوسط اور مطول۔ (۳) مولانا عبدالرؤف داناپوری کی اصح السیر۔

(۴) نعیم صدیقی کی محسن انسانیتؐ (۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سرورِ عالمؐ۔

سیرت نبویؐ کا چوتھا ماخذ تاریخ عالم کی کتابیں ہیں۔ اس حقیر کا خیال ہے کہ اگر اسی ترتیب سے سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سب سے زیادہ مستند اور معتبر طریقہ ہوگا۔ مثلاً قرآن کریم میں آپ کے بارے میں کوئی بات کہی گئی ہے وہ مجمل ہے تو اس کی تشریح پہلے صحیح احادیث میں تلاش کرنی چاہیے۔ وہاں نہ ملے تو سیرت و سوانح کی کتابیں پڑھنی چاہیں اور اگر ان کتابوں میں بھی نہ ملے تو تاریخ عالم کی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔

(۵) استفادے کا طریقہ

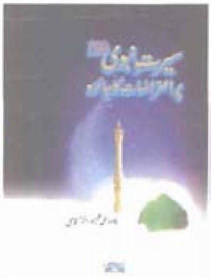
استفادے کے دو طریقے ہیں: علمی و عملی۔ علمی طریقے کی تفصیل اوپر گزری۔ عملی طریقہ یہ ہے کہ دین سے تعلق رکھنے والے ہر معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کو سامنے رکھ کر اس پر اسی طرح عمل کیا جائے جس طرح حضورؐ نے فرمایا یا خود اس پر عمل کیا ہے۔ انسان کے ظاہر و باطن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کی قولی یا عملی تعلیم سیرت نبویؐ میں موجود نہ ہو۔

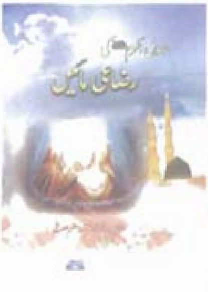
قرآن کریم نے تکمیل دین اور اتمام نعمت کا اعلان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی نجات و فلاح اور انسان کے روحانی ارتقا سے متعلق کوئی چیز چھوڑی نہیں گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بھی یہ بات واضح فرمادی ہے۔ میں صرف ایک حدیث کے ایک جامع ترین حصے کا ترجمہ یہاں پیش کرتا ہوں۔

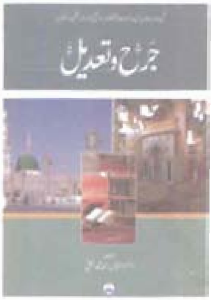
> ’’عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو تمہیں جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کرتی ہو الا یہ کہ میں نے تمہیں اس کا حکم دے دیا ہے اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو تمہیں دوزخ سے قریب اور جنت سے دور کرتی ہو الا یہ کہ میں نے اس سے تمہیں منع کر دیا ہے۔‘‘
>
> (مشکوٰۃ۔ کتاب الرقاق۔ باب التوکل والصبر)

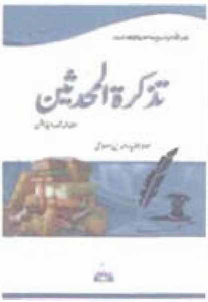
یہ حدیث امام بغوی نے شرح السنۃ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے اور ترتیب و الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ یہ حدیث حضرت جابرؓ اور حضرت ابوامامہؓ سے بھی مروی ہے۔ ابن ابی الدنیا، ابونعیم، حاکم اور ابن ماجہ نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ یہ ایک عظیم الشان حدیث ہے۔ (ماہ نامہ زندگی رام پور، اپریل ۱۹۸۴ء)

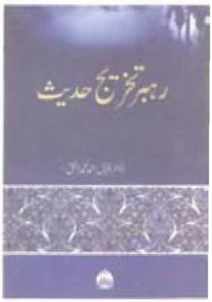












رحمان مارکیٹ ⊙ غزنی سٹریٹ ⊙ اردو بازار ⊙ لاہور ⊙ پاکستان

Ph: 042-37231119 , 0321-4021415

qasimulaloom@gmail.com